۵
خزاں ۱۹۹۰

آج

ترتیب : اجمل کمال

منوچہر خسروشاہی   بابا مقدّم   جمال میر صادقی

ثروت حسین   ذی شان ساحل   اوکتاویو پاز

یہودا امیحائی   جولیَن بارنز   فاروق خالد

محمد خالد اختر   علی امام نقوی

خورخے لوئس بورخیس

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

آج ستمبر ۱۹۹۰

مینیجنگ ایڈیٹر، پبلشر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۱

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی
کلاسیک
شاہراہ قائداعظم لاہور

ترتیب

۷
منوچہر خسروشاہی
مرگ

۱۳
بابا مقدّم
بارش اور آنسو

۱۹
جمال میر صادقی
ہوا کی بُوک

۲۳
ثروت حسین
خوب رو چلتے اگر بنفشئی دھند بندرگاہ میں صبح
حمد شاعری کا پرندہ ابھی تو میسّر مجھے بال و پر ہیں
دوپہر کی سلطنت میں مٹّی نیند سے باہر
منہ زور گھوڑے ایک دن میں نے پھولوں سے پوچھا

rekhta
Scanned with CamScanner

٢٨

ذی شان ساحل

شاعر اور مسخرے کشتی
پینٹنگ ایڈ پتھر نظم
ایک گیت جو کبھی پرانا نہیں ہوتا

٣٥

اوکتاویو پاز

نیلی آنکھوں کا گلدستہ
لہر کے ساتھ میری زندگی

٤٣

یہودا امیحائی

بہ ک قطر میری سابقہ طالب علم پرچم کیسے بنا
وہ مکان جس میں مَیں نے کئی خواب دیکھے
جو لوگ اپنا گھر چھوڑتے ہیں زندگی میں بعد از وقت
تم سیب کے اندر مجھ سے ملنے آتی ہو
ہماری محبّت کے عرصے میں ہمارے جسموں کے نشان کی طرح
بہت دنوں سے بیل گھر لوٹتا ہے اونچی ایڑی کے جوتے
میدانِ جنگ پر بارش خدا کی تقدیر ایک بار جاسوس
وہ مجھے بلاتے ہیں میں جس شہر میں پیدا ہوا
میرے پاس جنگ کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں

٥٦

جولیَن بارنز

ایما بوواری کی آنکھیں

٦٥

فاروق خالد

اپنی دعاؤں کے اسیر ۔ ٢

٨٣

محمد خالد اختر

ہندوستان کی سرسری تاریخ ۔ ٣

٩٩

علی امام نقوی

میراث

انتخاب

١٠٧

خورخے لوئس بورخیس

زخم کا ہلال المعتصم
پیراڈائزو گواہ تغیّرات خنجر الوداع
یونانی انتھولوجی کے ایک چھوٹے شاعر سے شطرنج
متی ، XXV ، ٣٠٠ دو مابعدالطبیعاتی پیکر

rekhta

Scanned with CamScanner

منوچہر خسروشاہی

مرگ

بہار آتے ہی وہ نمودار ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں کچھ بہت زیادہ نہیں تھے، بس کہیں کہیں دکھائی دے جاتے تھے کہ خود کو ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر گھسیٹ کر لیے جا رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی کوئی ہلکان ہو کر زمین پر ٹپک پڑتا۔ تم اس کے قریب جاتے تو دیکھتے کہ وہ کس طرح پڑے پڑے بل کھا رہا ہے اور اتنی اتنی سی ٹانگیں ہوا میں چلا رہا ہے۔ میں ان دنوں درخت پر بہت چڑھا کرتا تھا، اور ان میں سے جو زمین پر آ رہتے تھے ان کو روز دیکھتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں دیر تک کسی ایک کے قریب کھڑا اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کا تماشا دیکھتا رہتا۔ اس کی جدوجہد بےکار جاتی اور اسے سنبھلنا نصیب نہ ہوتا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ جو بھی نیچے ٹپکتا، پہلے تو بڑا زور لگاتا، بل کھاتا، ہاتھ پاؤں پھینکتا، لیکی رفتہ رفتہ سُست پڑنے لگتا اور آخر اپنی جگہ پر سیدھا سیدھا لیٹ جاتا۔ اور ٹھیک اس وقت چیونٹیوں کی پہلی کھیپ آ پہنچتی اور میں دیکھتا کہ کس طرح وہ اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے سینگوں سے چُھو چُھو کر اس کی جسامت کا اندازہ کر رہی ہیں۔ ان کے پہلے لمس سے اس نڈھال بدن میں دوبارہ جان سی پڑ جاتی۔ وہ سنبھالا لیتا اور پھر سے بل کھانے لگتا۔ کئی بار اس کی ٹانگوں کو جھٹکے لگتے لیکی اب مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چیونٹیاں کسی اَن دیکھے مرکز سے اُبلتی چلی آ رہی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیتیں، اور سب اسے اپنی اپنی طرف کھینچتیں۔ اس کا ایک ایک ریزہ نوچ کر لے جاتیں۔ پھر اس بےہیئت وجود میں نمی کی جو دو ایک بوندیں رہ جاتیں انہیں دھوپ چوس لیتی اور تھوڑی دیر بعد تم دیکھتے کہ کس طرح وہ سوکھا اور سیاہ اور لُچا کھچا درخت کے نیچے پڑا رہ گیا ہے۔

چیونٹیاں بڑی پھرتی سے اپنا کام کرتی تھیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے چھٹی کر دیتیں، اور ان

rekhta

Scanned with CamScanner

کچلے ور سوکھے ہوئے جسموں میں سے چند ٹیڑھی میڑھی اور ٹوٹی پھوٹی ٹانگوں کے سوا کچھ نہ رہ جاتا۔

ہاں، یہی ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں جب بھی دیکھتا کہ اُن میں سے کوئی نیچے ٹپکا ہے تو اس کے قریب پہنچ جاتا اور اس کھیل کو آخر تک دیکھتا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ اگر دنیا بھر کی چیونٹیاں اکٹھی ہو جاتیں تو بھی ان کو ٹھکانے نہیں لگا سکتی تھیں۔

کبھی کبھی، جب رات کو میری نیند اُڑی ہوئی ہوتی، میں بستر میں بیٹھا کان لگائے رہتا۔
ٹپ --- لو، ایک اور ---

OOOOO

اس کے بعد مجھے رات رات بھر جاگتے گذرنے لگی، اس لیے کہ یہ آواز مستقل میرے کانوں میں آتی رہتی تھی۔

ایک رات میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے ماں کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے سامنے بارہا روئی تھی۔ میں اس کا رونا پہچانتا تھا؛ چھوٹی چھوٹی ہچکیاں اور بَین، جو سمجھ میں نہیں آتے تھے، جیسے اپنے آپ کو مرثیہ سنا رہی ہو۔ اُس رات میں نے اس کا رونا سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے کوئی شے چٹخ کر الگ ہو گئی۔ میں کپکپا کر رہ گیا، اور مجھ کو ساری دنیا گریہ کرتی معلوم ہوئی۔ ماں کی ہچکیوں کی آواز فضا میں پیچ کھاتی، اور پھر ان کی ٹپ ٹپ کی آواز میں مل کر ایک ہو جاتی۔ وہ لگاتار ٹپک رہے تھے، اور ماں رو رہی تھی، روئے جارہی تھی۔

میں چیخیں مارتا ہوا کمرے سے باہر لپکا اور ٹھیک اس وقت کوئی چیز میرے سر پر گری ... ٹپ --- پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

OOOOO

ماں کہنے لگی:

"یہ درخت اب کی گرمیوں تک نہیں رہ پائے گا۔ سارے گھر میں چیونٹیاں بھر گئی ہیں! کیڑوں کو لے جانے کے لیے جھنڈ بنا بنا کر آتی ہیں، مگر یہ تو اتنے ہو گئے ہیں کہ چیونٹیوں کے بس کے نہیں رہے۔ دن میں کتنی کتنی بار صحن میں جھاڑو دیتی ہوں، کچھ فائدہ نہیں۔ اب تو کوڑا کاڑی ہمارے یہاں سے بس کیڑے اور چیونٹیاں ڈھونے بھر کی رہ گئی ہے۔"

ہمارے گھر کا اکیلا درخت کیڑوں میں بدلا جارہا تھا، اور چیونٹیاں انھیں اپنے بلوں میں لیے جا رہی تھیں۔ اب کے انھیں جاڑوں کی خوراک کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

وہ لٹائے دیتیں، اور بہار آتی تو جوان چیونٹیاں بلوں سے رینگتی ہوئی باہر آتیں۔ بہار آتی تو ہمارا درخت بھی چیونٹیوں کی صورت جوان ہوکر اُبھرتا تھا۔

ہمارے گھر کا اکیلا درخت جو آتے جاتے موسموں کا آئینہ تھا، جاڑوں میں اس کی شاخیں ننگی ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سردی سے کانپ رہا ہے، اور بےمروّت آسمان سے ذرا سی دھوپ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ بہار آتی تو ہری ہری صاف ستھری پتّیوں سے خود کو سجا لیتا،

ور گئی بہاروں کی یاد تازہ کرتا۔ اور گرمیاں --- گرمیوں میں تو ہم سبھی اس کے محتاج رہتے۔ وہ اپنی چھاؤں بےدریغ ہم پر لٹاتا، اور خود جُھلستی دوپہروں کی دھوپ کا جم کر مقابلہ کرتا۔ شام ہوتے جب سورج ڈوبنے لگتا اور درخت کا سایہ دور تک پھیل جاتا تو صحن میں جھاڑو دی جاتی اور درخت کے نیچے قالین بچھا دیا جاتا؛ سماور کی سُریلی سَنسناہٹ اور پیالیوں طشتریوں کی کھنک سنائی دیتی۔ بڑبڑاتی ہوئی ماں جلدی جلدی سب سامان تیار کر کے لگا دیتی، اور میں اَلکسایا ہوا کمرے سے باہر نکلتا اور سماور کی چوکی کے پاس آ بیٹھتا۔

گذشتہ گرمیوں تک یہی معمول تھا۔ گذشتہ گرمیوں تک میرا باپ زندہ تھا۔ اُس کا تخت اسی درخت کے نیچے بچھایا جاتا تھا۔ ہم دو لوگ اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے لاتے۔ یہیں پر وہ ہلکا چادرا اوڑھے لیٹا رہتا تھا۔ ماں اس کا سرہانا ٹھیک کرتی، اور وہ تکیے سے ٹیک لگائے دھیرے دھیرے ہانپتا اور ہمیں دیکھتا رہتا تھا۔ وہ مفلوج تھا۔ موت نے اس پر وار کیا تھا جو کاری نہیں پڑا؛ وہ فقط اپاہج اور گونگا ہو گیا تھا۔

معالجوں کا کہنا تھا امید رکھنا چاہیے۔ اگر وہ دوسرے حملے کو بھی جھیل جائے--- دوسرا وار --- میں جانتا تھا کہ وہ دوسرے وار کو روک نہیں پائے گا۔

کبھی کبھی ایک بڑے میاں، جو ہمارے یہاں آنے جانے والے واحد پڑوسی تھے، میرے باپ کی احوال پُرسی کے لیے آ نکلتے اور چائے کے برتنوں کے پاس کچھ دیر بیٹھتے۔ ان کی ٹھوڑی ہلتی رہتی اور نقلی دانتوں کا ڈھیلا چوکا منھ میں اِدھر اُدھر ہوا کرتا۔ وہ میرے باپ کے سوکھے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتے:

"کہو بھئی کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو؟"

پھر تسبیح گھما گھما کر وظیفہ پڑھنے لگتے۔ ماں اپنا چہرہ ڈھانک کر ایک طرف سمٹ جاتی۔ بڑے میاں اس سے بات نہیں کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے جاتے، اور گھر پھر سے خالی ہو جاتا۔

گرمیاں نکل گئیں۔ شروع جاڑوں میں موت نے دوسری اور کاری ضرب لگا ہی دی۔ اب اگر درخت گرمیوں تک رہ بھی جاتا، اگر سارے کیڑے اور چیونٹیاں غائب بھی ہو جاتیں اور یہ کابوس جاتا بھی رہتا، اور پھر سے شام کو صحن میں جھاڑو اور چھڑکاؤ کی ہماہمی ہونے لگتی، اور سماور سے سریلی سنسناہٹ بلند ہوا کرتی، تو بھی میرا باپ نہ ہوتا کہ تخت پر پڑا دھیرے دھیرے ہانپتا رہے اور ہمیں دیکھتا رہے۔

OOOOO

درخت گرمیوں تک نہیں رہ پائے گا، جیسے میرا باپ نہیں رہ پایا۔ درخت آہستہ آہستہ مر چلا تھا، اندر ہی اندر بوسیدہ ہو کر کیڑوں کی شکل میں باہر ٹپک رہا تھا اور سیدھا چیونٹیوں کے پرپیچ، تاریک، رازوں بھرے تہہ خانوں میں پہنچ رہا تھا، اور وہاں اس کا انبار لگ رہا تھا۔

درخت مر رہا تھا، اور ہمارا گھر اور بھی خالی ہوا جا رہا تھا۔

آخر چارہ جوئی شروع ہوئی۔ پہلے تو میں نے پڑوس والے بڑے میاں کو بلوا بھیجا، جو میرے باپ کے فاتحے کے بعد سے ہمارے یہاں نہیں آئے تھے، البتّہ کبھی کبھار گلی میں آتے جاتے

ملتے تو صاحب سلامت اور مختصر احوال پُرسی کر لیا کرتے تھے۔ وہ غروب کے وقت آئے۔ کچھ شرمندہ، کچھ افسردہ سے تھے۔ ہاتھ میں وہی تسبیح دھیرے دھیرے گھما رہے تھے۔ ماں سر سے چادر اوڑھ کر دروازے کے پاس آ بیٹھی۔ بڑے میاں نے آہستہ سے حال پوچھا، وہی ہمیشہ والی احوال پُرسی جو میرے باپ سے ہوتی تھی،

"کہو بھئی، کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو؟"

میں نے انھیں معاملہ بتایا۔ اس وقت میں تھوڑا جھنجھلایا ہوا تھا۔ بڑے میاں کسی سوچ میں ڈوب گئے، پھر بولے،

"چلو، ذرا دیکھیں تو۔"

میں نے چراغ جلایا اور ہم اندر صحن میں آ گئے۔

درخت بھر پر کیڑوں کے رَدّے جمے ہوئے تھے۔ پھر ٹپ ٹپ کی آوازیں سنائی دیں۔ ماں بولی،

"ابھی شام ہی کو جھاڑو دے کر باہر پھینک چکی ہوں۔ اسی طرح ٹپکے جا رہے ہیں۔ اے اللہ، تو ہی کچھ کر۔"

بڑے میاں کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے اور کیڑوں کو گھور رہے تھے۔ پھر انھوں نے گردن اٹھائی اور درخت کے تنے اور ٹہنیوں کو دیکھا کہ کوڑھیوں کے بدن کی طرح گل رہے ہیں۔

پھر ہم کمرے کے اندر آ گئے۔ چراغ کی روشنی میں یہ دیکھ کر میں سُن رہ گیا کہ ایک کیڑا بڑے میاں کے شانے پر سے ٹپکا اور فرش پر بل کھانے لگا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر اسے مارا اور کمرے کے بیچ میں ڈال دیا۔ ماں لپکی، اسے ایک کاغذ سے پکڑ کر اٹھایا اور باہر پھینک آئی۔

بڑے میاں کہنے لگے،

"میں سوچ رہا تھا مٹی بدلوا دی جائے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہو گا۔ مٹی میں بھی کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اب کوئی صورت نہیں۔ لکڑہاروں کو بلوانا ہو گا۔"

دوسرے دن آدمی آ گئے۔ بڑے میاں نے انھیں بھیجا تھا کہ درخت کو جڑ سے کھود کر لے جائیں۔

ooooo

ماں کمرے کے اندر تھی۔ چادر والیاں اس کو گھیرے ہوئے تسلّی دے رہی تھیں۔ ہر طرف رونے کی آواز تھی۔ مرد پہلو والے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ سب اکتائے ہوئے اور اداس اداس تھے۔ ابھی صبح ہوئی تھی، لیکن معلوم ہوتا تھا اندھیرا ہو رہا ہے۔ سیاہ متحرک پرچھائیوں سے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ میرا باپ عقبی کمرے میں تخت پر سیدھا سیدھا لیٹا تھا اور مُرا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ڈھک دیا گیا تھا۔ رات سے صبح تک قرآں خواں اس کے سرھانے تلاوت کرتا رہا تھا۔ میں اور میری کھلائی ایک کونے میں سکڑے بیٹھے تھے۔ قرآں خواں نے صبح تک دم بھر کو بھی تلاوت نہیں روکی تھی۔ آدھی رات گئے مجھے نیند آ گئی تھی، اور میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میرا باپ دونوں ہاتھ پھیلائے صحن کے بیچوں بیچ کھڑا ہے، اور اس کا سارا بدن کیڑوں

سے ڈھکا ہوا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جب بھی ان میں سے کوئی کیڑا نیچے ٹپکتا ہے، میرا باپ تھوڑا سا سکڑ جاتا ہے۔ لیکن وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہنس رہا ہے اور ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے۔ میں چیخیں مارتا ہوا اس کی طرف دوڑا، اور میری آنکھ کھل گئی۔ قرآں خواں کی آواز، رات کی سیاہی کو بڑھاتی ہوئی، اندھیرے میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔ میرا باپ تخت پر سیدھا سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پوشش کے نیچے اس کا بدن چھوٹا سا معلوم ہو رہا تھا۔

روشنی پھیلی، قرآں خواں کی آواز تھم گئی، سیاہ لباس والے آنا شروع ہوئے، اور کمرے ان سے بھر گئے۔ پھر اچانک ساری آوازیں بند ہو گئیں، اور میں نے سنا کہ میرے باپ کو لے جانے کے لیے لاش گاڑی آ گئی۔

ooooo

چھکڑا دروازے پر کھڑا تھا۔ درخت جڑ سے اکھڑ چکا تھا اور بیچ صحن میں سیدھا سیدھا لیٹا تھا۔ کیڑوں سے صحن کے فرش کی اینٹیں چھپ گئیں تھیں۔ چیونٹیاں بَولائی ہوئی سارے میں دوڑتی پھر رہی تھیں، بدحواس ہو رہی تھیں، اور آدمی گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور ماتھوں سے پسینا پونچھ رہے تھے۔ گڑھے کے ایک طرف مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ooooo

دو آدمی گڑھے کے اندر کھڑے تھے۔ میّت لائی گئی تو انھوں نے اسے ہاتھوں پر سنبھال کر نیچے رکھ دیا۔ سب نے درود پڑھا۔ عورتوں کے بَین اور بلند ہو گئے، اور مردوں کے شانے زیادہ زور زور سے ہلنے لگے۔ ایک بڈھی کُبّی عورت ماں کو چھاپ بیٹھی اور اسے تسلی دینے لگی۔ ماں اس کی توند کے نیچے دبی ہوئی کسی چوزے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اب سب میرے باپ کو مٹی دینے لگے۔ وہ گٹھری کی طرح سمٹ کر چھوٹا سا رہ گیا تھا۔ مٹی کے نیچے کہیں کہیں اس گٹھری کی سفیدی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ سفید دھبے دھیرے دھیرے غائب ہو رہے تھے، اور اس پر مٹی کی تہہ چڑھتی جا رہی تھی۔ رونے پیٹنے کی آوازیں بڑے آہنگ اور باقاعدگی کے ساتھ اونچی ہوتی جاتیں، پھر نیچے آتیں، پھر رفتہ رفتہ اونچی ہوتی جاتیں۔ کوئی کوئی آواز ایسی بھی تھی کہ لمحہ بھر کو کان سے ٹکراتی اور دوسرے لمحے غائب ہو جاتی۔ معلوم ہوتا تھا مدتوں اس کی مشق کی گئی ہے۔

ooooo

گڑھا پاٹا جا چکا تھا اور اب اینٹیں چنتا تھیں۔ صحن میں چیونٹیاں اور کیڑے اور آدمی بھاگتے پھر رہے تھے۔ صحن کا دروازہ پائوں پاٹ کھول دیا گیا تھا، اور درخت کو باہر گھسیٹا جا رہا تھا، اور صحن میں کیڑوں کے کچّھے کے کچّھے پڑے رہ گئے تھے۔ درخت پر طرف بیچوں کی طرح کیڑے چھڑکتا ہوا جا رہا تھا۔

اسے چھکڑے پر لادا گیا تو اس کی جڑ اوپر تھی اور شاخیں زمین پر رگڑ کھا رہی تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں سے سر نکلے ہوئے تھے، جیسے مٹی کی دیواروں پر پھول دار میخیں ٹھونک دی گئی ہوں۔

Scanned with CamScanner

میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے کمرے میں بیٹھ رہا۔ ماں بید کی طرح تھرتھرا رہی تھی، آپ ہی آپ بل کھا رہی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ بٹی کٹی عورت نے اسے چھاپ کر اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ باہر سے کیڑے اور چیونٹیاں کمروں کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ چیونٹیاں پہلے پہنچیں، اور دیواروں اور کھڑکیوں پر ہوتی ہوئی اوپر چڑھنے لگیں۔

اچانک میں نے دیکھا۔ صحن کے بیچ میں جہاں درخت تھا، جہاں اب اینٹیں چُن دی گئی تھیں، جہاں پر زمیں تھوڑی سی اونچی ہو گئی تھی، ٹھیک اسی جگہ، میں نے بڑے میاں کو دیکھا۔ وہ سلاخ کی طرح سیدھے کھڑے تھے اور انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے، اور ان کے سارے بدن پر کیڑے رینگ رہے تھے۔ اور میں نے پھر وہی جہنّمی آواز سنی؛

ٹپ ... ٹپ ... ٹپد

ooooo

درخت جا چکا تھا اور اپنی جگہ کیڑے اور چیونٹیاں چھوڑ گیا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرا مکان گرنے ہی والا ہے۔ اس کی ایک ایک چیز بوسیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کیڑے اس کے کھمبوں کے نیچے سے اور نیو کے اندر سے کلبلاتے ہوئے اوپر آ رہے ہیں۔ دیواروں میں، چھتوں میں، کھڑکیوں میں، ہر جگہ کیڑے بجبجا رہے تھے۔ مکان گرنے والا تھا، بکھرنے والا تھا، ریزہ ریزہ ہونے والا تھا۔ وہ بٹی کٹی عورت جس کے نیچے میری ماں چوزے کی طرح لوز رہی تھی اور چیخ رہی تھی، اس کو بھی کیڑے اندر ہی اندر کھائے جا رہے تھے۔ میں بھی اور میری ماں بھی، دونوں ریزہ ریزہ بکھرے جا رہے تھے۔

ہم سب کیڑوں کے مِل جانے سے بنے تھے، اور اب کیڑے الگ ہو رہے تھے اور باہر ٹپک رہے تھے، اور چیونٹیاں انھیں کھینچے لیے جا رہی تھیں اور آخر ہم بھی اسی درخت کی طرح چیونٹیوں کے گوداموں میں ذرّہ ذرّہ انبار ہو رہے تھے۔ ہمارا گھر، اپنی تمام یادوں سمیت، تمام قہقہوں، سسکیوں، الجھنوں، کڑوی باتوں، میٹھے بولوں کی نامحسوس جھلکیوں سمیت، اپنی سب نم بھری فضا سمیت، چلا جا رہا تھا، ہاتھ سے نکلا چلا جا رہا تھا۔

مجھے خیال ہوا میں نے بےکار ہی میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں۔ وہ آ کے رہیں گے۔ وہ کمروں کے اندر ہی موجود ہیں، وہ ہماری رگ رگ میں اتر چکے ہیں۔ وہ ہم کو آہستہ آہستہ، ذرّہ ذرّہ کھا رہے ہیں۔ وہ ہم کو اندر ہی اندر گلا رہے ہیں۔

میں اٹھا۔ میں نے کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے کھڑکی پر دے ماری، اور خود کو کمرے کے باہر ٹپکا دیا۔

فارسی سے ترجمہ : نیّر مسعود

بابا مقدّم

بارش اور آنسو

سرما کی شام تھی۔ بندرگاہِ پہلوی کے کہرآلود اور اداس ساحل پر میں اور محمود چہل قدمی کر رہے تھے۔ ساحل پر بس مَیں تھا اور وہ، اور موجوں کا شور، اور پرندوں کی آواز جو دور سمندر کی سطح پر ملےملے پَر مارتے چلے جا رہے تھے۔ آگے بڑھ کر سمندر تاریک ہو گیا تھا اور کالے بادل اس پر اس طرح جھک آئے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ وہاں آسمان اور سمندر مِل کر ایک ہو گئے ہیں۔

اُس نواح کی سردیوں میں ساحل کی فضا دُھندلی دُھندلی اور غم آلود سی ہو جاتی ہے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے بانس کے بنگلے اور لکڑی کے رنگ برنگے کیبن مکینوں سے خالی ہو کر خوابیدہ ہیولوں کی طرح پڑے نظر آتے ہیں؛ اور گلے ہوئے لٹھے، خالی ڈبّے، گذشتہ گرمیوں میں سمندر پر آنے والوں کے عارضی قیام کی بےرنگ نشانیاں، اور بوتلیں جنھیں موجیں ساحل پر پھینک دیتی ہیں، اور گھونگھے اور سیپیاں ریت پر بکھری ہوتی ہیں۔ وہاں پر آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ فراموشی اور خاموشی کی ان گھڑیوں میں وہ خود بھی حل ہوا جا رہا ہے۔ ایک اندوہ ناک سکوں اس کے وجود میں سرایت کرنے لگتا ہے اور مایوسی اور راٸیگانی کی ایک کیفیت نیم گرم بھپارے کی طرح اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ایک بہت بڑی موج سفید چادر کی طرح ہمارے پیروں کے آگے بچھ گئی۔ کچھ دیر تک زمیں پر سفید سفید جھاگ ٹِکا رہا، پھر وہیں کا وہیں جذب ہوگیا۔ ہمارے پیروں تلے بالو دب دب کر سخت ہوتی گئی اور اس میں سمندر کا پانی اکٹھا ہونے لگا۔ ہمارے پیر اسے دھنسا کر اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی اوپر کھینچ لیتے تھے۔ ہم پلٹے۔ مڑ کر دیکھا تو موجوں نے ہمارے قدموں سے پڑنے والے نشانوں کو بھر دیا تھا، گویا ہم وہاں تھے ہی نہیں۔ گویا کبھی کسی نے وہاں قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ محمود نے یہ دیکھا تو کہنے لگا،

"عجب دنیا ہے۔ چند سال پہلے تک میں اسی شہر میں توپ خانے کا افسر تھا۔ جنگ چھڑی تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ میں روسی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اسی شہر میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ روسیوں نے توپوں پر قبضہ کر لیا اور افسروں کو جیل میں ڈال دیا۔ سپاہی بھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ بس گھوڑے باقی رہ گئے۔ میرا گھوڑا اَبلق تھا؛ بڑا خوش رنگ، جوان اور چُلبُلا؛ خوب گردن باندھ کر چلتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی رنگت بھی انوکھی تھی، نیلی نیلی سی معلوم ہوتی تھیں۔ بارکوں میں اس کا نام کاسی پڑ گیا تھا۔ کاسی میری سواری کا گھوڑا تھا۔ جوانی اور مستی کے دن تھے۔ کاسی پر سوار ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ افسر کا گھوڑا تھا، اس لیے اس کی خیال داری اور مان گوں بھی دوسرے گھوڑوں سے زیادہ ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ چاق رہتا تھا۔ میں جیسے ہی اس پر سوار ہوتا، وہ ٹانگیں کھول کر چمکتا اور گردن اٹھا کر اگلی ٹاپوں پر دُلکی چلنے لگتا تھا۔ راستے کی پتھریلی زمین پر اس کے نعل پڑنے کی آواز سے فضا گونجنے لگتی تھی، اور داہنے بائیں لوگ کاسی کی مستانہ چال دیکھنے کے لیے چلتے چلتے رک جاتے تھے۔ میں اس پر سینہ تانے بیٹھا ہوتا اور خود بھی گردن اکڑا لیتا اور ترنگ میں آ کر جھومنے لگتا۔

میں اور کاسی شہر بھر میں مشہور تھے۔ کاسی مجھ سے اتنا ہلا ہوا تھا کہ اگر میں دور سے اس کو پکارتا تو وہ فوراً گردن گھماتا اور جواب میں ہنہنا کر مجھے دیکھنے لگتا۔ جب میں جیل میں بند ہوا تو سب سے زیادہ فکر مجھے کاسی ہی کی تھی، کہ معلوم نہیں اس کے دانے گھاس کی خبرگیری اور ملائی دلائی ہو رہی ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس کا کیا حشر کیا جائے گا۔ اور بھی ہزار فکریں تھیں۔ خود میرا کیا ہو گا؟ ہمیں یہیں قید رکھا جائے گا یا سائبیریا یا کسی اور علاقے میں پھینکا جائے گا؟ جنگی قیدیوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ مجھ کو کہا گیا کہ میں نے تو لڑائی میں توپیں استعمال کی تھیں اور اپنا سارا گولا بارود دشمنوں پر جھونک دیا تھا، اس لیے میرا انجام بہت برا ہونا ہے۔ لیکن کسی کو ٹھیک ٹھیک کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارا معاملہ کس کروٹ بیٹھے گا۔ جیل میں ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں ایک کونے میں جا بیٹھتا اور سوچا کرتا۔ دل چاہتا تھا آزاد ہو جاؤں اور جا کر کاسی کو دیکھوں؛ اس کی گردن تھپتھپاؤں، اس کی تھوتھنی پر ہتھیلی رکھ کر اس کی سانس کی گرمی محسوس کروں۔ یہ سارے خیال دن بھی رہتے، مگر راتیں!

راتیں وحشت ناک ہوتی تھیں۔ قیدیوں کے سونے کی اپنی اپنی ادائیں تھیں۔ کچھ تھے جو زور زور سے خراٹے لیتے تھے، بعض پوری آواز سے بولے جاتے، حکم احکام دیتے اور کبھی رونا شروع کر دیتے۔ ان کی فریادیں اور ہولیاں سن کر طبیعت میں عجب مایوسی اور افسردگی پیدا ہو جاتی۔ وہاں آدمی دیکھتا کہ لوگ کیا کیا ارمان لے کر سونے لیٹتے ہیں اور خوابوں کی دنیا میں پہنچ کر کابوسوں سے دوچار ہو جاتے ہیں، چلاتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں، گھگھیاتے ہیں۔ کبھی کسی بات کا اعتراف کر جاتے ہیں، کبھی کسی تمنا کا اظہار، اور کبھی بہکنے لگتے ہیں۔ میرے خوابوں کی دنیا کے زیادہ حصّے پر کاسی کا عمل تھا۔ مجھے اس کی نیلگوں آنکھیں نظر ہیں کہ اندھیرے میں چمکتی ہوئی میری طرف ٹکٹکی باندھے ہیں۔ ان نگاہوں میں التجا ہوتی

اور ملامت بھی ہوتی۔

ایک دن جیل میں خبر پھیل گئی کہ کل روس والے توپیں اور گھوڑے جہازوں میں بھرکر لیے جا رہے ہیں۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کاسی کا کیا ہوا؟ اسے بھی لیے جا رہے ہیں؟ اگر یہی ہوا؟ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ یہ اُس بھی ٹوٹ جائے گی کہ کبھی کاسی کو پھر دیکھ سکوں گا۔ وہ میرا دوست تھا۔ ہم دونوں ہی جنگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اور اب اس کو لیے جا رہے تھے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو کاش میں بھی اس کے ساتھ چلا جاتا۔ میں نے اپنے ساتھی قیدیوں کے سامنے توپوں اور گھوڑوں کا ذکر چھیڑا، اور کاسی کے بارے میں ان کا خیال دریافت کیا۔ سب قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ آخر ایک قیدی نے کہا کہ کاسی سواری کا گھوڑا ہے، توپ گاڑی کھینچنے کے کام کا نہیں! پھر لڑائی کا زمانہ ہے، رسد کی یوں ہی کمی ہے، اس لیے یقینی بات ہے کہ کاسی کو کاٹ کر اس کا گوشت کھا لیا جائے گا۔

تو کاسی کو ذبح کر ڈالا جائے گا، اور اس کا گوشت فوجیوں کو کھلا دیا جائے گا۔ پھر وہ فوجی بھی محاذوں پر مارے جائیں گے۔ بےچارے!

اسیر ہونا اور جیل میں پڑنا بری چیز ہے۔ قید میں آدمی کا مزاج عجیب سا ہو جاتا ہے۔ خود پر اس کا بس نہیں ہوتا اور وہ ایک زائد شے بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر دن، ہر ساعت اس کے دماغ میں ہزار خیالوں کے بلبلے اُبھرتے ہیں اور ایک ایک کر کے پھوٹ جاتے ہیں۔ رات آتی ہے تو خوابوں کی کہربلی دنیا کے آسیب اس پر یلغار کرتے ہیں۔ دوسرے دن پھر وہی فکریں، وہی خیال، وہی ہراس، وہی ناامیدی، وہی جیل کے بدذائقہ پتلے شوربے کے ساتھ سخت پتھر روٹیاں نگلنا اور سوچتے رہنا۔

جب یہ خبر اڑی کہ کل گھوڑوں کو لے جائیں گے، مجھے سارے دن کاسی ہی کا خیال آتا رہا۔ رات کو بھی بڑی بےچینی نیند سویا۔ دوسری صبح ہم سب قیدی وقت سے پہلے جاگ اٹھے تاکہ جیل کی کھڑکیوں سے توپوں اور گھوڑوں کے جانے کا تماشا دیکھیں۔ یہ تماشا دیکھنا بھی ایک تماشا ہی تھا۔ آدمی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کا مال لُوٹے لیے جاتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتا۔

ہم کھڑکیوں کے پاس جاکھڑے ہوئے۔ وہاں سے بارکوں کا احاطہ اور اصطبل دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ بارش کی ہلکی دھند میں دور سے گھوڑوں کے سر نظر آئے۔ ایک ایک روسی سپاہی، دو دو کوتل گھوڑوں کو دہانوں سے پکڑے کھینچتا لا رہا تھا۔ گھوڑوں کو دیکھ کر مجھ پر عجب ناامیدی سی چھا گئی، دل دھڑدھڑ کرنے لگا، ٹانگوں میں دم نہ رہا اور منہ خشک ہو گیا۔ پھر بھی میں نے گردن آگے بڑھا دی کہ ان گھوڑوں میں کاسی کو تلاش کروں۔ ہماری فوج کے سب گھوڑے گہرے رنگوں کے سُرنگ اور کُمیت تھے۔ صرف کاسی کے رنگ میں سفیدی اور اُجلاپن تھا۔ وہ اَبلق گھوڑا تھا۔ اس کے بدن بھر پر چھوٹی چھوٹی بھوری اور کتھئی چتّیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفید رنگ پر ان دو رنگوں کا چھینٹا دیا گیا ہے۔

دور پر میں نے اس کا چتکبرا رنگ دیکھا۔ میری سانس گھٹنے لگی۔ وہی تھا۔ اس کے تیوروں کا تیکھاپن اور گردن کا کھنچاؤ رخصت ہو چکا تھا۔ سر لٹکا ہوا اور کنوتیاں گِری ہوئی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ اگلی چہل پہل اور طراروں کا کہیں پتا نہ تھا۔ میلا چکٹ ہو رہا تھا۔ ٹانگوں پر کیچڑ اور لید کے ٹھکے جم گئے تھے۔ ہفتوں سے نہ ملائی دلائی ہوئی تھی، نہ کھریرا پھیرا گیا تھا۔

وہ جیل کے سامنے پہنچا تو میری زبان کو قفل لگ گیا۔ چاہتا تھا پکاروں، کاسی کو بلاؤں، چوکی داروں سے کہوں کہ اسے ذرا میری جانب گھما دیں۔ میں نے کسی طرح خود کو سنبھالا اور سوکھے گلے سے دو تین بار صرف ایک لفظ نکال پایا:

"کاسی! کاسی! کاسی!"

ابلق گھوڑے میں جان سی پڑ گئی۔ یقین کرو اس کی گردن تن گئی، اس نے سر گھمایا، اور جہاں سے میں نے اسے پکارا تھا اس طرف دیکھنے لگا اور زور سے ہنہنایا۔ نہیں معلوم قیدیوں کے جھرمٹ میں کھڑکی کے پیچھے میں اس کو دکھائی دیا کہ نہیں، مگر چند لمحوں کے لیے اس کے پیروں میں وہی رقص کی سی چلت پھرت نظر آئی، پھر سپاہی نے اس کے دہانے کی آہنی ڈنڈی کو اس کے منھ کے اندر زور سے کھٹکھٹایا اور تکلیف کی شدت سے اس کی حالت پھر اسی طرح ردی ہو گئی۔

کاسی کو لے گئے۔ دوسرے گھوڑوں کے ساتھ اسے بھی جہاز پر چڑھا دیا گیا اور ہم دور سے دیکھتے رہے کہ وہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔

OOOOO

ہم دونوں سنسان پشتے پر چل رہے تھے۔ سمندر کی جانب سے تیز ہوا کے جھونکے آ رہے تھے اور موجیں پشتے سے ٹکرا ٹکرا کر پانی اڑا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ میں نے محمود کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اور رخساروں پر تری تھی۔ میں نے پوچھا:

"کیا روتے ہو؟"

وہ بولا:

"نہیں۔ ہماری عمروں کے آدمی روتے نہیں۔ آنسو ہی نہیں نکلتے۔ بارش ہوتی ہے۔"

OOOOO

اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سمندر کالا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم واپس آنے لگے اور راستے میں اس کو میں نے یہ قصہ سنایا:

"میں فوج میں نیا نیا افسر ہوا تھا۔ روز صبح صبح اپنے گھر کی گلی کے آگے سڑک پر جا کھڑا ہوتا۔ میری رجمنٹ کی بس آتی اور میں اس پر سوار ہو کر کیمپ چلا جاتا تھا۔ ایک دن میں ذرا جلدی سڑک پر آ گیا، کچھ بس نے بھی دیر لگائی۔ میرا ایک دوست اُدھر آ نکلا اور ہم وہیں کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی فوج میں افسر تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایک خوبصورت بادامی سمند گھوڑا ہے، جسے وہ بیچنا چاہتا ہے۔ میں اس دوست سے بہ خوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ معاملت کا کھرا آدمی ہے، اور سمند گھوڑے مجھ کو پسند بھی تھے، لہٰذا میں نے جانور کو دیکھے بغیر خرید لیا اور سودا وہیں کا وہیں پکّا ہو گیا۔ دوست یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ اسی دن گھوڑے کو میری رجمنٹ میں پہنچوا دے گا۔

ہماری رجمنٹ کا پڑاؤ شہر سے فاصلے پر تھا اور دوپہر کو ہم وہیں رہ جاتے تھے۔ اس دن میں کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا کہ ایک سپاہی خبر لایا کہ گھوڑا آ گیا ہے۔ ہماری کیمپ کے بیچ میں ایک لمبی سڑک تھی، جس کے دونوں طرف چنار اور سفیدار کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ان میں سفیدار چناروں سے اونچے نکل گئے تھے۔ میں دفتر سے باہر آ کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ دیکھا ایک سپاہی شوخ رنگ کے ایک گھوڑے پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔ بڑے قدکاٹھ اور بلند گردن کا گھوڑا تھا۔ جسامت ایسی کہ زین پر بیٹھا ہوا سپاہی چھوٹا سا معلوم ہو رہا تھا۔ قریب آیا تو میں نے دیکھا عجب خوش اندام اور خوش رنگ گھوڑا ہے۔ اس کے رونگٹے سنہری مائل تھے اور جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ چھوٹا سر، نرم چمکیلی آنکھ، مضبوط جوڑ بند اور بھاری سُم، اونچی گردن، تنا ہوا سینہ، چلنے رکنے میں سر کو باندھے ہوئے۔ اس چھب کا گھوڑا آج تک میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ سمند گھوڑا کم ہی ہوتا ہے، خصوصاً یکساں اور شوخ بادامی رنگ کا سمند۔ میں بےاختیار ہو کر اس کی سری اور کنوتیاں سہلانے لگا۔ وہ مزے میں کھڑا رہا جیسے برسوں کا مجھ سے ہلا ہوا ہو۔ سپاہی اس پر سے اتر پڑا اور میں وہیں آزمائش کے لیے اس کی رکاب میں پیر ڈال کر زین پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا آگے بڑھا تو میں نے اسے پویا چلایا، پھر دُلکی، اس کے بعد کیمپ کی سڑک پر دور تک بڑے اطمینان کے ساتھ سرپٹ دوڑایا۔ اس کی سواری ایسی ہموار اور آرام دہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا نرم گدّے پر بیٹھا ہوں اور فضا میں تیر رہا ہوں۔

ہم نے اس کو اصطبل میں پہنچا دیا، اور وہاں سپاہی کو لوٹانے کے لیے اس کا زین اتارا گیا تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ خوب صورت گھوڑا زین پُشت ہے۔ زین پشت اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی کمر میں نیچے کی طرف خم ہوتا ہے۔ یہ گھوڑے کا عیب سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس خم کے زیادہ ہونے سے گھوڑے کا دم کم ہوجاتا ہے۔ اس گھوڑے کی کمر میں زیادہ خم تھا۔ اس کی پیٹھ کا وہ حصّہ جہاں زین رکھتے ہیں، کمان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ لمحہ بھر کو مجھے خیال آیا کہ اسے پھیر دوں۔ لیکن میرا جی نہ مانا۔ بہت خوب صورت گھوڑا تھا۔ اس کی اصالت، اس کے تیور اور اس کے جمال سے کیوں کر آنکھیں پھیر لیتا۔ گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دیا گیا اور دوسرے دن سے وہ میری سواری میں رہنے لگا۔ تمھارے اور اس ابلق گھوڑے کی طرح، مجھ میں اور اس سمند میں بھی عجیب چاہت اور لگاؤ پیدا ہو گیا۔ میرا بلند قامت زین پشت سمند، جو گردن اٹھا کر چلتا اور ہن ہن کر زمین پر پاؤں رکھتا، بہت جلدی مشہور معروف ہو گیا۔ سرپٹ چال میں وہ صرصر کی طرح فضا کو چیرتا نکل جاتا تھا، اور چونکہ اس کی کمر میں خم تھا اس لیے اس پر بیٹھنے میں بڑی راحت ملتی تھی۔

ایک ہی دو سال گذرے تھے کہ توپ گاڑیاں پٹرول سے چلنے لگیں۔ پرانی چال کی گاڑیاں کباڑخانوں میں ڈھیر ہوتی گئیں اور انھیں کھینچنے والے گھوڑے گلّوں میں بھیجے جانے لگے۔ فوج سے اصطبل اور گھوڑوں کا صیغہ ہی ختم ہو گیا تو میں بھی مجبور ہوا کہ اپنے سمند کو وہاں سے ہٹا لے جاؤں؛ اور چونکہ میرے پاس اسے رکھنے کا ٹھکانا نہیں تھا، اس لیے اس کو بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دو تین ہفتے اسی اُدھیڑبُن میں نکل گئے۔ میرا دل اس کو الگ کرنے پر کسی طرح نہیں اٹھتا تھا، مگر بالآخر، جب سارے اصطبل گھوڑوں سے خالی ہو گئے، اور توپ

گاڑیاں ہٹا دی گئیں، اور خود بھی میرا تبادلہ بھی اسٹاف میں ہو گیا، تب مجھے اپنے گھوڑے کو صبر کرنا ہی پڑا۔ میری رجمنٹ کا ایک سائیس، جو چھٹی میں آ گیا تھا، ایک خریدار کو ڈھونڈھ کر لے آیا۔ اس نے گھوڑے کو دیکھا بھالا، پسند کر لیا اور پیسے بھی اچھے دیے۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا کہ اس لاڈلے گھوڑے کو تکلیف نہ دے، اور اگر اسے بیچے تو کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بیچے جو اس کو قلی یا چھکڑے میں نہ جوتے۔

کئی مہینے گذر گئے۔ مجھے اپنے زیں پشت سمند کی یاد آتی رہتی تھی اور، جیسا کہ تم نے بتایا، میرا بھی دل چاہتا تھا کہ کسی صورت اسے دیکھوں، تھپتھپاؤں اور اس بےزبان کے منھ کے آگے اپنا ہاتھ کروں اور اس کی گرم اور نم سانسوں کو محسوس کروں۔

ایک دن خیابانِ شمیران کی چڑھائی پر مجھ کو ایک اونچا، لاغر، زیں پشت گھوڑا دکھائی دیا۔ آنکھیں بجھی بجھی، نڈھال بدن پسینے میں تربتر، مگر اسی آن کے ساتھ، جو مجھے اپنے سمند میں نظر آتی تھی، بوجھ سے لدے ہوئے ایک کھڑکھڑے میں جُتا اسے کھینچ رہا تھا۔ کوچوان نیچے اتر کر اس پر چابکیں برسا رہا تھا اور کھڑکھڑے کو دھکا لگا کر تیزی سے چڑھائی چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہی تھا۔ اس کا سنہرا بدن میل کچیل اور پسینے کے لیپ سے چکٹ کر کالا ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس کو قریب سے جا کر دیکھوں، اسے پکاروں اور اس کا بدن سہلاؤں، لیکن مجھے اس سے شرم سی آ رہی تھی۔ وہ ایسے حال میں نہ تھا کہ میں اس کے سامنے جا سکتا۔ اس کی رگیں ابھر آئی تھیں اور داہنے بائیں، پٹھوں پر اور پیٹھ پر چابک کی مار سے نالیاں سی بن گئی تھیں۔ میں نے سوچا کوچوان سے بات کر کے گھوڑے کی کچھ سفارش کروں، لیکن اس سے ہوتا کیا۔ وہ شکستہ حال قیدی، وہ تھکا ہارا زیں پشت سمند، جو اب میرا نہیں تھا، اپنے مقدر کا لکھا پورا کر رہا تھا۔ میں خود سمجھ سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا۔

OOOOO

پانی تیز برسنے لگا تھا اور تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں اور محمود اپنے کمرے پر پہنچ گئے تھے۔ بلب کی روشنی میں محمود نے مجھے دیکھا اور بولا،

"تمھارا چہرہ بھیگا ہوا ہے۔ روئے ہو؟"

"اس عمر کو پہنچ کر آدمی روتا نہیں"، میں نے کہا۔ "پانی برس رہا ہے۔"

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

جمال میر صادقی

ہوا کی ہُوک

وہ بڈھا کھڑا ہوا تھا اور دُہری سڑک کے اُس پار گھور رہا تھا۔ اُس پار، سڑک کی درمیانی نہر کے کنارے، ایک جوان عورت اور ایک تگڑا سا مرد کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سڑک خالی تھی، البتّہ کبھی کبھی کوئی موٹرکار آ کر تیزی سے نکل جاتی تھی۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ چنار کے درختوں کو جھنجھوڑیاں دیتی ہوئی تُند ہوا سے سڑک کی خاک اُڑ اُڑ کر فضا میں پھیل رہی تھی۔

بڈھے کے رعشہ دار ہاتھ میں ہلتی ہوئی لاٹھی ڈامر کے فٹ پاتھ پر کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہِل رہے تھے اور منھ سے بےمعنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں سڑک کی دوسری سمت سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ تگڑا آدمی نحیف بدن کی مختصر سی عورت کے سامنے جھکا ہوا ہاتھ نچا نچا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ عورت کے لمبے سیاہ بال ہوا سے اڑ رہے تھے اور اس کے لپیٹے چہرے پر سڑک کی ڈھول جم رہی تھی۔

ان دونوں سے کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے سرخ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ اسٹیرنگ کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور ان پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

بڈھا لاٹھی ٹیکتا ہوا نہر کی سمت بڑھا۔ نہر مٹ میلے پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی، اور غرّاتی ہوئی سڑک کی ڈھال کے رخ بہہ رہی تھی۔ بڈھا اُدھر سے پلٹ کر سڑک کے پُل کے پاس پہنچا، تیزی کے ساتھ پل کو پار کر کے دوسری طرف اُترا، اور اسی تیزی سے اُدھر کی سڑک بھی پار کرنا چاہتا تھا کہ لاری کی طویل چیخ نے اس کے قدم روک دیے۔ ایک لاری اس کے قریب سے سن کر زن سے نکل گئی۔

لاٹھی ٹیکتے ہوئے بڈھے نے سڑک کی چوڑائی پار کی اور جلدی سے خود کو نہر کے کنارے پر پہنچا دیا۔ تگڑے آدمی نے عورت کی بانہہ پکڑ لی تھی اور اس کو آہستہ آہستہ سرخ کار کی

Scanned with CamScanner

طرف لیے جا رہا تھا۔

بڈھا پیچھے سے ان کے سر پر آ پہنچا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر ایک جما ہوا ہاتھ مارا۔ لاٹھی تکڑے آدمی کے سر کے پاس سے ہوتی ہوئی اس کے بائیں بازو پر پڑی۔ وہ اچھل کر پلٹا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ بڈھے کی لاٹھی پھر اٹھی، لیکن اس کا نشانہ چوک گیا۔ تکڑے آدمی کی حیرت زدہ آواز بلند ہوئی،

"---!!!!!"

اس نے بڈھے کی لاٹھی کو، جو پھر بلند ہو گئی تھی، بیچ ہی میں پکڑ لیا۔ بڈھے کی سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھا، لپک کر عورت کو پیچھے کھینچا اور بولا،

"کھڑی رہو، پاگل ہے۔"

اس نے بڈھے کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف مروڑ دیا۔ بڈھا تکلیف سے کراہنے لگا۔ عورت ان کی طرف لپکی اور چیخی،

"چھوڑو، چھوڑو!"

مرد پلٹا اور بھونچکا سا ہو کر عورت کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا،

"میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ خرافاتی خود ہی بھڑا ہوا ہے۔"

اس نے بڈھے کو چھوڑ دیا۔ لاٹھی زمین پر گر گئی۔ بڈھا گالیاں بکتا ہوا پھر اس پر جھپٹا۔ آدمی نے ٹاؤ کھا کر اس کے منہ پر ایک ہاتھ رسید کیا اور لاتیں مار مار کر اسے پیچھے کھدیڑنے لگا۔ بڈھا اُلٹے پاؤں ہٹتا گیا، یہاں تک کہ اس کے پیر نہر کی پکی منڈیر سے ٹکرائے اور وہ چاروں شانے چت پانی میں جا پڑا۔

اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور پکار کر پوچھا،

"کیا بات ہے، عبدول؟ یہ بڈھا کہاں سے آ مرا؟"

تکڑا آدمی برا سا منہ بناتے ہوئے مڑا اور بولا،

"قسم سے، مجھے نہیں پتا۔ کم بخت نے میرا ہاتھ ---"

وہ اپنا بازو سہلانے لگا۔ اسٹیرنگ والے نے پھر پکار کر پوچھا،

"پاگل واگل ہے کیا؟"

عورت بڈھے کی طرف دوڑی جو نہر میں پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بڈھے کے چہرے پر خون تھا اور سر اور منہ سے پانی کی دھاریں گر رہی تھیں۔

ہوا درختوں کو کبھی جھکاتی، کبھی سیدھا کرتی۔ اس پاس کے مکانوں کی دوچھتیوں میں بوکتی پھر رہی تھی۔ چنار کے سوکھے پتے اڑ رہے تھے اور درختوں کی سنسناہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔

فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک راہگیر ٹھٹک کر رک گیا اور پوچھنے لگا،

"کیا معاملہ ہے؟"

تکڑے آدمی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ دھمکانے کے انداز میں راہگیر کی طرف ہاتھ لہرا کر بولا،

"جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو جی!"

اسٹیرنگ والے نے پھر پکار کر کہا،

"اسے چھوڑو بابا! چلو نا، کہاں اٹک گئے؟"

بڈھا اب نہر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سفید بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا، پورا بدن کیچڑ میں لت پت ہو گیا تھا اور ٹخنوں سے خون نکل رہا تھا۔ عورت اس کے پہلو میں زمین پر بیٹھ گئی تھی اور رومال سے اس کے چہرے کا خون پونچھ رہی تھی۔ اس کا اپنا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

تکڑے آدمی نے جھک کر عورت کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ عورت نے غضب ناک ہو کر خود کو چھڑا لیا اور چیخی،

"چھوڑ مجھ کو، قوّمساق!"

آدمی اس کا بازو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں اسٹیرنگ والے کی طرف مڑ کر دیکھا اور بےبسی کے ساتھ شانے اچکائے۔ اس کے چہرے اور بدن کی ایک ایک جنبش سے ظاہر تھا کہ وہ بری طرح سٹپٹایا ہوا ہے۔

اچانک بڈھا اچھل کر کھڑا ہو گیا اور عورت پر گھونسے اور لاتیں چلانے لگا۔ عورت نے گردن جھکا رکھی تھی اور خود کو بڈھے کے حملوں کے حوالے کر دیا تھا۔

نہر کے اس طرف والے فٹ پاتھ پر دو آدمی اور ایک بچہ چپ چاپ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بڈھا عورت پر پلا پڑا تھا اور دونوں مٹھیوں میں اس کے بال جکڑے ہوئے اپنے گھٹنوں اور ایڑیوں سے اس کو کوٹنے ڈال رہا تھا۔ عورت اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے زمین پکڑے بیٹھی تھی اور ذرا بھی مدافعت نہیں کر رہی تھی۔ ہوا اسی طرح سڑک پر بوک رہی تھی اور درختوں کے شور سے اسی طرح ہنگامہ برپا تھا۔

اسٹیرنگ والا کار کو بڑھا کر قریب لایا اور اس پر سے کود کر نیچے اترا۔ اس نے طیش میں آ کر بڈھے کو پیچھے ڈھکیل دیا اور عورت کو گھسیٹ کر اس کے پنجے سے چھڑایا۔ وہ بےہوش سی ہو کر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔

تکڑا آدمی آگے بڑھا۔ دونوں نے مل کر عورت کو زمین پر سے اٹھایا اور گاڑی کی طرف لے چلے۔

بڈھا ان کے پیچھے لپکا۔ آدمی نے پلٹ کر اسے ایک اور دھکا دیا۔ بڈھا اُلٹ کر سڑک پر گر گیا۔ تکڑے آدمی نے عورت کو گود میں اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

بڈھا لنگڑاتا اور شور مچاتا ہوا گاڑی کے پیچھے دوڑا، لیکن گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔ اسٹیرنگ والے نے گاڑی کے عقبی آئینے میں اس کو دیکھا اور بولا،

"باندھ کر رکھنے والا ہے، پاگل!"

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھائی، پھر بولا،

Scanned with CamScanner

"ہم نہ پہنچ گئے ہوتے تو بچی کو مار ہی ڈالا تھا۔"
اس کی پشت پر عورت کی سسکیوں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

فارسی سے ترجمہ : نیّر مسعود

ثروت حسین

خوب رو چلتے اگر

خوب رو چلتے اگر تم
دور تک پھیلی زمیں پر
سرخوشی کے بیج ہوتے
دیر تک پھولوں میں سوتے
خوب رو چلتے اگر تم
شہر کی بنیاد رکھتے
لوگ ہم کو یاد رکھتے
خوب رو چلتے اگر تم

بنفشئی دُھند

میں اپنے اوراق گن رہا تھا
کہ آن پہنچی بہارِ تازہ
بنفشئی دُھند سے کسی نے
مجھے پکارا

rekhta
rekhta
Scanned with CamScanner

بندرگاہ میں صبح

جہازوں کے عرشے پہ لاکھوں فرشتے
ہلاتے ہوں رنگیں رومال جیسے
مجھے مل گئے ہیں پَر و بال جیسے

حمد

پرستش کے پودے کو سینچا ہے میں نے
لہو سے، لہو سے گذرتی ہوئی آب جو
سے، مری آبیاری سے روشن ہوئے
ہیں گلابی شگوفے، پرستش کی خوشبو
کو پایا ہے میں نے، نہایت کے
اُجلے افق پر، پرندے، پرستش کے
پودے کے اطراف ایسے اترتے ہیں
جیسے فرشتے ...

شاعری کا پرندہ

باغ کے اک گوشۂ تنہائی میں میری طرح
آب و خاک و باد کی یک جائی میں میری طرح
منہمک ہے قافیہ پیمائی میں میری طرح

ابھی تو میسّر مجھے بال و پَر ہیں

ابھی تو میسر مجھے بال و پر ہیں
کھلے جابجا باد و باراں کے در ہیں
پَروں کی سکت آزمانی ہے مجھ کو
محبت کے اک زمزمے کے علاوہ

پس انداز کچھ بھی نہیں کر سکا ہوں
تجھے سونپنے کے لیے اے پرندے
لہو کی روانی کا قصّہ ہے باقی
ابھی عمر کا ایک حصہ ہے باقی

دوپہر کی سلطنت میں

دوپہر کی سلطنت میں
فاختہ کچھ بولتی ہے
زندگی پَر کھولتی ہے
نیند سے باہر نکل کر
میں نے اس کے ہونٹ چکھے
آئنے پر پھول رکھے
دوپہر کی سلطنت میں

مٹّی

مددگار مٹّی، مددگار مٹّی کے سینے پہ بادل، ہری کھیتوں کے سمندر، جزیرے، جہاں تک نظر جائے اُودے افق پر، پرندے، شرابور قریے، مضافات کو جاتی پکڈنڈیوں کے سہارے، کنارے کنارے لڑکپن کے پھول اور معصوم پتّے، فراموش گاری کے گہرے کنویں کی منڈیریں، منڈیروں پر دیوے، مسافر تجھے کیا، تجھے دور جانا ہے، اس بیل گاڑی کے پہیے شکستہ ہیں، لیکن ارادے مددگار مٹّی سے رس کھینچتے ہیں۔

نیند سے باہر

جاگ اٹھتا ہوں کسی آواز پر، تکیے کے نیچے
پھول کچھ رکھے ہوئے ہیں، نیند سے باہر نکل کر
دھوپ نے دروازہ کھولا، جل پری کی آنکھ
سے آنسو نہیں موتی گرے تھے، دھوپ کے پیراک

rekhta

Scanned with CamScanner

نے غوطہ لگایا اور آنسو کھینچ لایا، اینٹ
گارے سے بنی پیلی عمارت، کھڑکیوں سے
گر رہے ہیں کاغذی رومال جیسے، یا فرشتے
سرمئی مٹی پہ اپنے پاؤں دھرتے، سانس
روکے دیکھتے ہیں، آدمی کو رقص کرتے

منھ زور گھوڑے

منھ زور گھوڑے
ہواؤں کے منھ زور گھوڑے
ہواؤں، صداؤں کے منھ زور گھوڑے
ہواؤں، صداؤں، گھٹاؤں کے منھ زور گھوڑے
ہواؤں، صداؤں، گھٹاؤں، دشاؤں کے منھ زور گھوڑے
ہواؤں، صداؤں، گھٹاؤں، دشاؤں، خلاؤں کے منھ زور گھوڑے

ایک دن میں نے پھولوں سے پوچھا

یونہی ایک دن مَیں نے پھولوں سے پوچھا
کہ اب تک کہاں تھے
انھوں نے بتایا کہ مٹی کے تاریک
سینے میں سوئے ہوئے تھے
گھنی کالی نیندوں میں کھوئے ہوئے تھے
وہیں پر چٹختے ہوئے بیج میں آنکھ کھولی
زمیں ہم سے بولی
کہ جاؤ
مٹی سے آزاد ہو جاؤ
تازہ ہواؤں میں گاؤ
سو ہم آ گئے ہیں
ہمارے وہ نغمے جو مٹی میں سوئے ہوئے تھے
ہمارے لبوں پر بکھرنے لگے ہیں

پرندوں کا یہ چہچہانا ہمارا ہی رخ ہے
بہاروں کا موسم یہی ہے
یونہی ایک دن میں نے پھولوں سے پوچھا

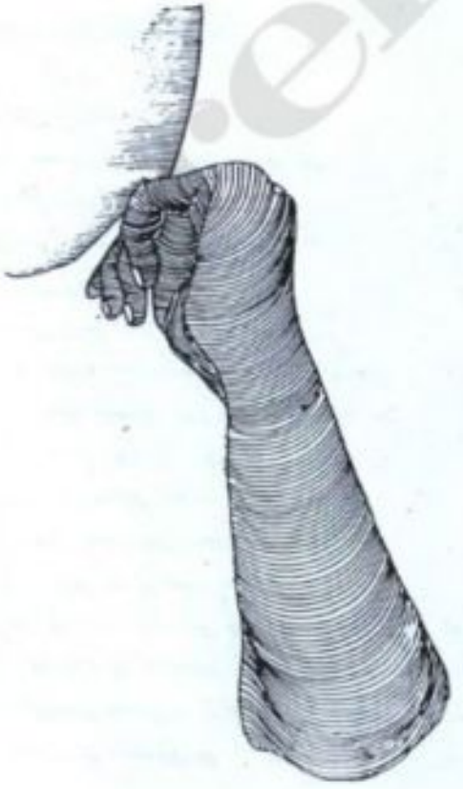

rekhta
Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

شاعر اور مسخرے

ہمارے یہاں عام طور پر
ہر موقعے پر
شاعر اور مسخرے
ایک جیسی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں
اور کرسیوں تک آنے کے لیے
ایک ہی راستے سے گذرتے ہیں
اور اس راستے سے پہلے
ایک ہی زینے سے اوپر چڑھتے ہیں
شاعر اور مسخرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
چلتے چلتے مسخرا زور زور سے ہنستا ہے
شاعر روتا ہے، اور ہم
دونوں کی آوازیں ساتھ ساتھ سنتے ہیں
اور بھول جاتے ہیں، دھیان ہی نہیں دیتے
اس بات پر کہ ان میں سے
شاعر کی آواز کون سی ہے، اور مسخرے کی کون سی
اور اس بات پر کہ ہمیں
مسخرے کی ہنسی پر توجہ دینی چاہیے
یا شاعر کے آنسوؤں پر

اور اس بات پر کہ ہمیں
شاعروں، مسخروں اور کرسیوں میں
کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا

کشتی

ہم لکھنے والے
وہ کہانی ہیں
جو خزاں میں لکھی جاتی ہے
اور بہار میں سنائی جاتی ہے
اور وہ گیت ہیں
جو اندھیرے میں گایا جاتا ہے
اور روشنی میں
دہرایا جاتا ہے

ہم ایک ایسی دیوار ہیں
جو کسی راستے میں نہیں آتی
اور ایک ایسا دروازہ
جو ہمیشہ دریا کی طرف کھلتا ہے
اور ایک ایسی کھڑکی
جو کبھی بازار کی طرف نہیں کھلتی

ہم ایک ایسا درخت ہیں
جسے آپ کاٹ تو سکتے ہیں
مگر لگا نہیں سکتے
ہم اس درخت کے
کاٹے جانے کا افسوس
ہم اس درخت میں
پھوٹنے والی کونپلوں
کی خوشی

rekhta

Scanned with CamScanner

ہم اس درخت کا سایہ ---
اور ہم اس کی لکڑی سے بنی ہوئی
ایک ایسی کشتی ہیں
جس میں بھیڑیے
سفر نہیں کرسکتے

ہیئرنگ ایڈ

رات گہری ہونے پہ
ستارے
جو باتیں کرتے ہیں
ب مجھے سنائی نہیں دیتیں
ہوا تیز چلنے پر
درخت
جو الفاظ دہراتے ہیں
اب میری سمجھ میں نہیں آتے
میرے کانوں تک آتے آتے
جنگل، قالین بن جاتا ہے
اور رات ہو جاتی ہے دیوار

شور مچاتی ہوئی چڑیا کی وجہ سے
اوس سے چمکتی ہوئی گھاس
بارش ہو جاتی ہے
اور دیوار پر لگی ہوئی گھڑی
دروازہ بن جاتی ہے
محبت تبدیل ہو جاتی ہے
خاموشی میں، اور اندھیرا
مجھے لگتا ہے خواب

بہت کوشش کرتا ہوں
کہ ذرا سی خرابی سے

زندگی اور لفظوں میں
بہت زیادہ فرق نہ آنے پائے
خاصی دیر تک
لوگوں کی ہونٹوں کی حرکت
آنکھوں کی چمک کے
ساتھ ساتھ چلتا ہوں
مگر ان کے دل تک
پھر بھی نہیں پہنچ پاتا۔

پتّھر

"تمھارے ہاتھ پتّھر کے ہیں
مگر کتنے نرم ہیں"
وہ کہتی ہے، اور یہ کہ
میرے ہاتھ اس کا دل ہیں
اور وہ میری ہتھیلیوں میں رہتی ہے،
اور وہ کہتی ہے یہ بھی کہ میری آنکھیں
اس کے آنسوؤں سے زیادہ گہری نہیں
لیکن میرے خوابوں میں
اس کی آنکھوں سے زیادہ ستارے
اور کشتیاں ہیں،
وہ کہتی ہے، اور ایک چھوٹا سا پتھر
آسماں کی طرف اچھالتی ہے
میں اسے پانی پر
دائرے بنا کر ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہوں
وہ مجھ سے پوچھتی ہے
یہ پتّھر کہاں تک جا سکتا ہے؟
بارش کے پانی میں ڈوبی ہوئی
ایک قبر تک ---
نہیں، وہ کہتی ہے
پھانسی گھر کے میداں میں بچھی ہوئی ریت تک
نہیں، نہیں، وہ پھر کہتی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

کتابوں کی دکان میں رکھے ہوئے گلدان تک
شاید، مگر ایسا نہیں ہو گا
تم نے دیکھا نہیں، یہ پتھر
میرے دل میں سوراخ کرتے ہوئے
تمہارے ہاتھوں تک چلا گیا ہے

نظم

جب تم قالین پر
اپنی انگلیوں سے
ایک ایسی دنیا کا نقشہ بناتی ہو
جہاں دریا اور آسماں
ایک ہی رنگ سے ظاہر کیے جاتے ہیں
جہاں ستارے اور بادل
ایک ساتھ چلتے ہیں اور ٹھہرتے ہیں
اور جہاں پھول اور آنسو
ایک ہی دیوار کے ساتھ
رکھے اور اٹھائے جاتے ہیں
جہاں ہمارے خوابوں سے بھری ہوئی
ایکسپریس ٹرین
کبھی پٹری سے نہیں اترتی
اور جہاں تمہاری یاد
سڑک پار کرتے ہوئے
کسی تیز رفتار گاڑی کے نیچے نہیں آتی
اور جہاں پھولوں کی نمائش کے بعد
اداسی اور گیس لائٹر
انعام میں نہیں دیا جاتا

تمہاری بناتی ہوئی
اسی دنیا کے ایک کمرے میں
کسی وجہ سے جب آگ لگتی ہے
تم اسے بجھانے کے لیے

اپنا کوئی آنسو روانہ نہیں کرتیں
مجھے وہیں چھوڑ کے
قالین پر سے
اپنا ہاتھ ہٹا لیتی ہو

ایک گیت جو کبھی پرانا نہیں ہوتا

یہ سفر جو میں کر رہا ہوں
کبھی ختم نہیں ہو گا
جب بھی ٹرین رکتی ہے،
کسی اسٹیشن پر
یا اندھیرے میں چمکتی ہوئی پٹریاں
ایک دوسرے سے ملتے
یا جدا ہوتے لگتی ہیں
مجھے ایک کہانی یاد آنے لگتی ہے
میں ایک خواب دیکھنے لگتا ہوں
اور اس خواب میں تمہاری آنکھیں
ایک ایسا گھر بن جاتی ہیں
جس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں
مگر جہاں کسی دیوار پر میری یاد
کیلنڈر کی طرح نہیں ہے

اسی خواب میں
میں ایک بازار سے گذرتا ہوں
جہاں ہر پوسٹر پر
تمہاری نظم لکھی ہے
یہ راستا تمہارے کمرے کی طرف
نہیں جاتا
میں نے جن درختوں سے
تمہاری باتیں کی تھیں
یہاں ان میں سے کوئی نہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

ریلوے انجن پوری آواز سے چیختا ہے
ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگتی ہے
اور میں سنتا ہوں ایک گیت
جو کبھی پرانا نہیں ہوتا

اوکتاویو پاز

نیلی آنکھوں کا گُلدستہ

میں پسینے سے تر بتر، نیند سے چونک اٹھا۔ سُرخ اینٹوں کے فٹ پاتھ سے، جس پر تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا، بھاپ کے گرم لپٹے اُٹھ رہے تھے۔ خاکستری پَروں والا ایک پتنگا بدحواس ہوکر پیلی پیلی بتی کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ میں اپنے جھولی کھٹولے سے لپک کر اٹھا اور کمرے کے دوسری طرف اس احتیاط سے ننگے پاؤں چلتا ہوا آیا کہ میرا پاؤں کسی بچھو پر نہ پڑ جائے جو تازہ ہوا کی تلاش میں اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آیا ہو۔ میں چھوٹی سی کھڑکی کے پاس آیا اور دیہات کی ہوا میں سانس لینے لگا۔ رات کا تنفّس سنائی دے رہا تھا، نسوانی اور عظیم الجثّہ۔ میں کمرے کے وسط میں آ گیا، صراحی سے پانی بیسن دانی میں ڈالا اور تولیہ بھگو لیا۔ میں نے سینے اور ٹانگوں پر گیلا کپڑا رگڑا، ذرا خشک کیا اور، یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ میرے کپڑوں کی تہوں میں کوئی کیڑے مکوڑے تو نہیں گھسے ہوئے ہیں، تیار ہو گیا۔ میں بھاگتا ہوا ہرے زینے سے اُترا۔ مسافرخانے کے دروازے پر میری مڈھ بھیڑ اس کے مالک سے ہو گئی، جو ایک آنکھ سے کانا، گھنّے مزاج کا آدمی تھا۔ بیر کے مونڈھے پر بیٹھا ہوا، ایک آنکھ ادھی میچے ہوئے، وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ بیٹھی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا،

"کہاں چل دیے، صاحب؟"

"ذرا ٹہلنے کے لیے۔ گرمی بہت ہے۔"

"ہوں، سارا بازار بند ہو چکا ہے۔ اور یہاں سڑکوں پر بجلی کے کھمبے بھی نہیں ہیں۔ یہیں ٹِک کے بیٹھے رہو تو اچھا ہے۔"

میں نے کندھے اُچکائے، زیرلب کہا "جلدی لوٹ آؤں گا"، اور اندھیرے میں داخل ہو گیا۔ پہلےپہل کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ میں گلی کے پتھروں کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میں نے سگریٹ سُلگا لیا۔ اگلے ہی لمحے اچانک چاند ایک سیاہ بادل کے پیچھے سے نکل آیا، اور ایک سفید دیوار

rekhta
Scanned with CamScanner

میں نے املی سے بھری ہوا کو اپنے سانسوں میں اُتار لیا۔ پتّوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی رات گنگنا رہی تھی۔ لمبی گھاس میں ٹڈے اچھل رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، وہاں ستاروں نے اپنی چھاؤنی چھا دی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ کائنات علامتوں کا ایک وسیع نظام ہے، دیوزادوں کے درمیان مکالمہ ہے۔ میری حرکات، جھینگروں کی آواز، ستاروں کی ٹمٹماہٹ، محض وقفے اور مصوتے تھے اس مکالمے کے منتشر فقرے۔ وہ لفظ بھلا کیا ہو سکتا ہے، مَیں جس کا ایک حرف ہوں؟ وہ لفظ کون ادا کرتا ہے؟ وہ لفظ کس سے کہا جاتا ہے؟ میں نے اپنا سگریٹ فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ وہ گرتے گرتے ایک چمک دار قوس بناتا گیا، جس میں سے چنگاریاں ہوں اڑ رہی تھیں جیسے کسی چھوٹے سے شہاب ثاقب سے۔

میں بہت دیر تک آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا تھا، اور محفوظ، ان دو ہونٹوں کے درمیان جو عین اسی لمحے اس قدر مسرّت کے ساتھ مجھے ادا کر رہے تھے۔ رات آنکھوں کا باغ تھی۔ میں نے سڑک پار کی تو کسی کو دروازے سے باہر آتے ہوئے سُنا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مگر اندھیرے میں کسی بھی چیز کو پہچان نہ سکا۔ میں چلتا رہا۔ چند لمحوں بعد، میں نے گرم پتّھروں پر جوتیوں کے گھسٹنے کی آواز سُنی۔ میں مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا، حالاں کہ میں ہر قدم کے ساتھ اس سائے کو بڑھتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بھاگنا چاہا۔ میں ایسا کر نہیں سکا۔ میں رُک گیا۔ اس سے پہلے کہ اپنا بچاؤ کرتا، مَیں نے اپنی پیٹھ میں چاقو کی نوک چُبھتی ہوئی محسوس کی، اور ایک شیریں آواز،

"حرکت نہ کرنا، صاحب، ورنہ اندر کر دوں گا۔"

مڑے بغیر میں نے پوچھا،

"کیا چاہتے ہو؟"

"تمھاری آنکھیں، صاحب۔" اس نرم، دکھی ہوئی سی آواز نے کہا۔

"میری آنکھیں؟ تم میری آنکھوں کا کیا کرو گے؟ دیکھو، میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں۔ زیادہ نہیں، پھر بھی کچھ تو ہیں۔ میرے پاس جو ہے سب تمھیں دے دوں گا، اگر مجھے جانے دو۔ مجھے جان سے نہ مارو۔"

"ڈرو نہیں، صاحب تمھیں ماروں گا نہیں۔ بس صرف تمھاری آنکھیں نکالوں گا۔"

"مگر تم میری آنکھوں کا کیا کرو گے؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"میری محبوبہ کو عجیب ضد چڑھی ہے۔ وہ نیلی آنکھوں کا گلدستہ چاہتی ہے۔ اور یہاں ایسی آنکھوں کا ملنا دُشوار ہے۔"

"میری آنکھیں تمھارے کسی کام نہ آئیں گی۔ وہ بھوری ہیں، نیلی نہیں۔"

"مجھے بےوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو، صاحب۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تمھاری آنکھیں نیلی ہیں۔"

"اپنے ایک ساتھی انسان کی آنکھیں مت نوچو۔ میں تمھیں ان کے بدلے کچھ اور دے دوں گا۔"

"میرے سامنے زیادہ نیک مت بنو۔" وہ دُرشت لہجے میں بولا۔ "ادھر مُڑو۔" میں مُڑ گیا۔ وہ کم قد اور نازک سا تھا۔ لمبی ٹوپی نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں دیہاتی وضع کا چُھرا تھا جس کا پھل چاندنی میں چمک رہا تھا۔

"مجھے اپنا چہرہ دیکھنے دو۔"

"میں نے ماچس کی تیلی جلائی اور اپنے چہرے کے سامنے لے آیا۔ تیز روشنی سے میری آنکھیں چُندھیانے لگیں۔ اس نے مضبوط ہاتھوں سے میرے پپوٹے تھام لیے۔ وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ پنجوں کے بل کھڑے ہوکر وہ میری طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کیا۔ تیلی کے شعلے سے میری انگلیاں جُھلسنے لگیں۔ میں نے تیلی کو گرا دیا۔ خاموشی کا ایک لمحہ گزر گیا۔

"اب تمھیں اعتبار آیا؟ وہ نیلی نہیں ہیں۔"

"بڑے چالاک ہو، ہے نا؟" اس نے جواب دیا۔ "اچھا، دیکھتے ہیں۔ ایک اور جلاؤ۔"

میں نے ایک اور تیلی سُلگائی اور اپنی آنکھوں کے پاس لے آیا۔ میری آستیں پکڑ کر اس نے حکم دیا،

"گھٹنوں کے بل جُھک جاؤ۔"

میں جُھک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے میرے بال پکڑ لیے، اور میرا سر کھینچ کر پیچھے کر دیا۔ وہ مجھ پر جُھک گیا، متجسّس اور کچھ پریشان سا۔ اور اس کا چُھرا نیچے آتا رہا، یہاں تک کہ میری پلکوں سے چُھو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں کُھلی رکھو۔" اس نے حکم دیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ شعلے سے میری پلکیں جُھلسنے لگیں۔ اچانک اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

"ٹھیک ہے، نیلی نہیں ہیں۔ دفع ہو جاؤ۔"

وہ غائب ہو گیا۔ میں اپنا سر ہاتھوں میں تھامے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ پھر اپنے اوسان بحال کیے۔ گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا اور پھر سنبھلتا، کوئی گھنٹے بھر تک اس ویران شہر میں بھاگتا رہا۔ میں جب چوک پر پہنچا تو دیکھا کہ مسافرخانے کا مالک ابھی تک دروازے کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ میں ایک لفظ بھی کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اگلی صبح میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔

ooooo

لہر کے ساتھ میری زندگی

جب میں نے وہ سمندر چھوڑا تو ایک لہر اوروں سے آگے بڑھتی چلی۔ وہ دراز قد اور سبک اندام تھی۔ اوروں کے احتجاج کے باوجود، جنھوں نے اس کے آبی ملبوس کا دامن تھام کر روکنا

Scanned with CamScanner

چاہا، اس نے میری بانہہ پکڑ لی اور میرے ساتھ اُچھلتی چلی۔ میں اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ اسے اس کے سنگی ساتھیوں کے سامنے ٹوک کر شرمندہ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور پھر بڑے بوڑھوں کی غصیلی نظروں نے مجھے مفلوج کر دیا۔ ہم شہر تک آئے تو میں نے اسے سمجھایا کہ یہ ناممکن ہے، کہ شہر کی زندگی ویسی نہیں ہے جیسے وہ اس لہر کی خوش تدبیری سے سوچتی آئی ہے جس نے کبھی سمندر سے آگے نہیں دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھتی رہی۔ "نہیں، تمہارا فیصلہ ہو چکا۔ تم اب واپس نہیں جا سکتے۔" میں نے نرمی، درشتی، طمع و تشنیع، سب آزما کر دیکھ لیے۔ وہ روئی، چیخی، لپٹ لپٹ گئی اور دھمکانے لگی۔ مجھے معذرت کرنا پڑی۔

اگلے دن سے میری مشکلیں شروع ہو گئیں۔ ہم ریل پر کنڈکٹر کی، مسافروں کی، پولیس والوں کی نظروں سے بچ کر کس طرح سوار ہو سکتے تھے؟ مانا کہ قانونی ریل گاڑی پر لہروں کی نقل و حمل کے بارے میں خاموش ہے، مگر اسی سے اس سختی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کے ساتھ ہماری اس حرکت سے نمٹا جائے گا۔ بہت غور و فکر کے بعد روانگی سے گھنٹا بھر پہلے میں اسٹیشن پہنچا۔ سیٹ سنبھال لی اور، جس وقت کوئی دیکھ نہیں رہا تھا، مسافروں کے پانی پینے کی ٹنکی کو خالی کر دیا، اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی رفیقہ کو اس میں انڈیل دیا۔

پہلا واقعہ اس وقت ہوا جب قریب بیٹھے ہوئے ایک خاندان کے بچوں نے شور مچا کر اپنی پیاس کا اعلان کیا۔ میں نے انھیں بہلا لیا اور ان سے ٹھنڈے شربت کا وعدہ کیا۔ وہ میری بات ماننے ہی والے تھے کہ ایک اور مسافر کا ہاتھ آگے بڑھا۔ میں اسے بھی اپنی دعوت میں شریک کرنے والا تھا کہ اس کی ساتھی کی نظر دیکھ کر رک گیا۔ خاتون نے کاغذی پیالا اٹھایا، ٹنکی کے پاس آئیں اور ٹونٹی کھول دی۔ ان کا پیالا آدھا بھرا ہو گا کہ میں لپک کر ان خاتون اور اپنی رفیقہ کے درمیان آ گیا۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں معافی مانگ رہا تھا کہ بچوں میں سے ایک نے ٹونٹی کھول دی۔ میں نے اسے دوبارہ بند کر دیا۔ خاتون نے کاغذی پیالا اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا،

"ارے، یہ پانی نمکین ہے۔"

بچے نے ان کی بات دوہرائی۔ کئی مسافر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان مسافروں نے کنڈکٹر کو بلا لیا،

"اس شخص نے پانی میں نمک ڈالا ہے۔"

کنڈکٹر نے انسپکٹر کو بلایا،

اچھا تو آپ پانی میں ملاوٹ کرتے ہیں؟"

انسپکٹر نے پولیس کو طلب کر لیا،

"تو آپ نے پانی کو زہریلا کر دیا؟"

پولیس نے کپتان کو طلب کیا،

"تو تم ہو زہر ملانے والے؟"

کپتان نے تیں کارندوں کو بلایا۔ کارندے باقی مسافروں کی ناراض نظروں اور سرگوشیوں کے دوران مجھے ایک خالی گاڑی میں لے گئے۔ اگلے اسٹیشن پر انھوں نے مجھے اتار دیا اور دھکیل کر گھسیٹتے ہوئے قید خانے لے گئے۔ کئی دن تک طویل تفتیش کے علاوہ کسی نے مجھ سے بات تک نہ کی۔ جب میں نے اپنا ماجرا بتایا تو کسی نے میرا اعتبار نہ کیا، قیدخانے کے مہتمم نے بھی نہیں، جو اپنا سر ہلاتا رہا اور کہتا رہا، "معاملہ گمبھیر ہے، بہت گمبھیر۔ تم بچوں کو زہر تو نہیں دینا چاہتے تھے؟" ایک دن وہ مجھے مجسٹریٹ کے سامنے لے آئے۔

"تمہارا معاملہ بہت مشکل ہے،" اس نے دوہرایا۔ "میں اس کو فوجداری عدالت کے سپرد کروں گا۔"

ایک برس گزر گیا۔ چوں کہ کسی کو نقصان نہیں ہوا تھا، اس لیے میری سزا بھی ہلکی تھی۔ کچھ عرصے بعد میری آزادی کا دن آ گیا۔

قیدخانے کے مہتمم نے مجھے اندر بلایا،

"اچھا تو اب تم آزاد ہو۔ تمہاری قسمت اچھی تھی، کسی کو نقصان نہیں ہوا۔ آئندہ ایسا مت کرنا، اس لیے کہ اگلی بار اتنی مختصر نہیں ہو گی ---"

اور اس نے مجھ پر وہی غصّے بھری نظر ڈالی جس سے لوگ مجھے دیکھتے آئے تھے۔

میں نے اسی دوپہر کی گاڑی پکڑی اور کئی گھنٹوں کے بےآرام سفر کے بعد میکسیکو شہر آ پہنچا۔ میں ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔ اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے ہنستے گنگناتے کی آواز سنی۔ میرے سینے میں درد کی لہر اٹھی، جیسے تعجب کی لہر کی تھپیڑا، جس وقت تعجب ایک لہر کی صورت سینے سے ٹکراتا ہے۔ میری رفیقہ وہاں موجود تھی، ہمیشہ کی طرح ہنس رہی تھی، گا رہی تھی۔

"تم یہاں کیسے آئیں؟"

"آسانی سے۔ ریل میں آئی۔ کسی نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد، کہ میں محض نمک ملا پانی ہوں، مجھے انجن میں اونٹا دیا۔ پھر اس سے آگے سفر ذرا دشوار تھا۔ جلد ہی میں ابخارات کا بادل بن گئی۔ جلد ہی بارش کی پھوار بن کر مشیں پر گری۔ میں بہت بےآب ہو گئی۔ میری کتنی ہی بوندیں کھو گئیں۔"

اس کی موجودگی نے میری زندگی بدل دی۔ اندھیرے برآمدوں اور دھول سے اٹے سامان والا گھر، ہوا اور دھوپ اور آوازوں اور نیلے اور ہرے عکسوں سے بھر گیا، خوش باش گونج اور لرزشوں سے آباد ہو گیا۔ ایک لہر میں کتنی لہریں ہیں، اور وہ کیسے دیوار یا الماری کے ماتھے پر سمندری جھاگ کا جھومر سجا کر ساحل، چٹان اور پل بنا دیتی ہے! ناکارہ کونے کھدرے، خس و خاشاک کی آماج گاہیں بھی اس کے نرم ہاتھوں کے لمس سے محروم نہ رہے۔ ہر چیز ہنسنے لگی، دانتوں کی طرح چمکنے لگی۔ ان پرانے کمروں میں سورج بہت مزے سے داخل ہوتا اور میرے گھر پہروں رہتا، دوسرے گھروں، سارے محلے، شہر اور پورے ملک کو چھوڑ کر۔ اور کئی راتوں کو، بہت دیر گئے، حیرت زدہ ستاروں نے اسے دبےپاؤں میرے گھر سے جاتے ہوئے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

محبت ایک کھیل تھی، تخلیقِ مسلسل تھی۔ جو تھا وہ ساحل تھا، اور ریت، ان چادروں کا بستر جو ہمیشہ تازہ اور بےداغ رہتا۔ اگر میں اسے گلے لگا لیتا تو وہ انبساط سے پھول جاتی، بلند ہو جاتی، جیسے بیدمجنوں کا ڈنٹھل پانی میں۔ اور پھر وہ سبک بدن پھول سی کھل کر سفید پروں کا جھرنا بن کر جھڑنے لگتی، مسکراہٹوں کا طرّہ بن کر میرے سر اور میری پیٹھ پر بہنے لگتی اور اپنے اُجالے سے مجھے ڈھک لیتی۔ یا پھر وہ میرے سامنے بکھر کر پھیل جاتی، افق کی طرح لامحدود، یہاں تک کہ میں بھی افق اور سناٹا بن جاتا۔ لہریے دار اور بھری بھری، وہ مجھے اپنے اندر سمیٹ لیتی، موسیقی کی طرح، دیوزاد بوسوں کی طرح۔ اس کی موجودگی کا مطلب تھا، ہم آغوشیوں کی، سرگوشیوں، بوسوں کی ایک مستقل آمد و رفت۔ اس کے پانیوں میں رَل مِل کر میں تختے تختے بھیگ گیا اور پلک جھپکتے میں اپنے آپ کو بلندی پر پایا۔۔۔ چکروں کی انتہا پر، کسی ان جانے بھید سے وہاں معلّق۔۔۔ اور پھر اپنے آپ کو کنکری کی طرح گرتے ہوئے اور بڑے آرام سے خشکی پر اتارے جاتے ہوئے محسوس کیا۔ ان پانیوں میں سونے کی کوئی مثال نہیں ہے کہ ہلکے ہلکے خوش گوار تھپیڑوں سے جاگوں، ہزاروں ہلکے حملوں سے، جو پھر ہنستے ہوئے پیچھے لوٹ جاتے ہیں۔

مگر اس کے وجود کے مرکز تک کبھی نہ پہنچ سکا۔ کبھی چھو نہ سکا درد اور موت کی اس برہنگی کو۔ شاید یہ لہروں میں ہوتی ہی نہیں۔ وہ خفیہ مقام جو عورت کو فانی اور ضرب پذیر بنا دیتا ہے، وہ برقی گھنڈی جہاں سب کچھ ہم آہنگ اور باہم متوسّل ہوتا ہے، پھڑکتا ہے اور سیدھا کر غش کھا جاتا ہے۔ اس کا طرزِ احساس، عورتوں کی طرح، موج موج پھیلتا تھا۔ بس صرف یہ موجیں ہم مرکز نہ تھیں، بلکہ مرکز گریز تھیں کہ ہر بار اور دور تک پھیلتی جاتیں، یہاں تک کہ انہوں نے نئی کہکشاؤں کو چھو لیا۔ اس سے محبت کرنا، بعید رابطوں تک وسعت حاصل کرنا تھا، دور دراز کے ان ستاروں کے ساتھ دھڑکنا تھا جن کے وجود کا ہمیں شائبہ تک نہ تھا۔ مگر اس کا مرکز؟ نہیں، اس کا کوئی مرکز نہیں تھا، محض خلا تھا جیسے گردباد میں ہوتا ہے، جس نے مجھے اپنے اندر کھینچ لیا اور دبوچ لیا۔

ساتھ ساتھ لیٹ کر ہم گہرے رازوں اور سرگوشیوں اور مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے۔ لپٹ کر وہ میرے سینے پر گر جاتی اور وہاں سرسراہٹوں کا سبزہ بن کر اگنے لگتی۔ چھوٹا سا گھونگا بن کر وہ میرے کان میں گیت سناتی۔ وہ فروتن اور شفاف بن جاتی، شانت پانی۔ چھوٹے سے جانور کی طرح میرے پیروں پر پڑ جاتی۔ وہ اتنی صاف تھی کہ میں اس کا ایک ایک خیال پڑھ سکتا تھا۔ کچھ راتیں ایسی تھیں کہ اس کی جلد پر ایک تابش سی پھوٹ آتی، اور اس سے ہم آغوش ہونا، اس پارۂ شب سے ہم کنار ہونا تھا جسے آگ سے گودا گیا ہو۔ مگر وہ تیرہ و تلخ بھی ہو جاتی۔ بےمہر ساعتوں میں وہ گرجنے لگتی، کراہتی، پیچ و تاب کھاتی، لوٹنے لگتی۔ اس کی سسکاریوں سے پڑوسی جاگ اٹھتے۔ اس کی آواز سن کر سمندر کی ہوا گھر کے دروازے پر کھرینچیں مارنے لگتی، یا چھت پر پوری آواز سے چیخنے لگتی۔ بادلوں سے گھرے موسم سے اسے وحشت ہوتی، وہ سامان توڑنے پھوڑنے لگتی، گالیاں بکتی، مجھے توہین آمیز جملوں اور ہرے اور مٹ میلے جھاگ سے ڈھک دیتی۔ وہ تھوکتی، روتی، چلاتی، کوسنے دیتی، بددعائیں

کرتی۔ چاند سے، ستاروں سے، دوسری دنیاؤں کی روشنی سے متاثر ہو کر وہ اس طرح اپنی کیفیات اور ہیئت تبدیل کرتی کہ میں مبتلائے حیرت ہو جاتا، مگر وہ جوار بھاٹے کی طرح مہلک تھی۔

وہ اپنی تنہائی کے لیے بڑکنے لگی۔ سارا گھر گھونگھوں سے، اور سیپیوں سے، اور ان چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیوں سے بھرا ہوا تھا جنھیں اس نے اپنے غصے کے اندھیریں میں توڑ دیا تھا۔ (اوروں کے ساتھ، علامتوں سے بھری ہوئی، ہر رات وہ میرے ماتھے سے الگ ہو کر اس کی تند یا خوش گوار ہواؤں میں اتر جاتیں۔) اس مدت میں کتنے خزانے گم ہوئے! مگر میری کشتیاں اور گھونگھوں کا خاموش نغمہ کافی نہ تھے۔ مجھے اپنے گھر میں مچھلیوں کا جھنڈ قائم کرنا پڑا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں رقابت کے احساس سے عاری نہیں تھا، جس وقت میں نے انھیں اپنی رفیقہ میں تیرتے ہوئے، اس کی چھاتیاں سہلاتے ہوئے، اس کی ٹانگوں کے درمیاں سوتے ہوئے اور اس کے بالوں کو رنگ کے کوندوں سے آراستہ کرتے ہوئے دیکھا۔

ان تمام مچھلیوں میں چند ایک بالکل تُندخُو اور قابلِ نفرت تھیں، ماہی خانے کے چیتوں کی طرح، جن کی آنکھیں بڑی بڑی اور ساکت تھیں اور دہانے کانٹےدار اور خون کے پیاسے تھے۔ نہیں معلوم کیا کیا فتور تھا، جس کی وجہ سے میری رفیقہ کو ان کے ساتھ کھیلنے میں مزا آتا، اور وہ ان کے لیے ایسی بےشرم پسندیدگی ظاہر کرتی کہ میں اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ اس بھیانک مخلوق کے ساتھ پہروں مجالست میں رہتی۔ ایک دن مجھ سے اور برداشت نہ ہو سکا، میں نے دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا اور ان کے پیچھے لپکا۔ مستعد اور آسیب آسا، وہ میرے ہاتھوں سے بچ نکلیں، اور وہ کھلکھلاتی ہوئی میرے سینے پر دھموکے مارنے لگی، یہاں تک کہ میں گر پڑا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ڈوب رہا ہوں۔ اور میں غرق ہو کر مر جانے اور نیلا پڑ جانے کو تھا کہ اس نے مجھے کنارے پر اچھال دیا اور مجھے چومنے لگی۔ خدا معلوم کیا کیا کہنے لگی۔ اور اسی اثنا میں اس کی شہوت کی وجہ سے میں نے آنکھیں موند لیں، کیوں کہ اس کی آواز شیریں تھی اور وہ مجھ سے غرقاب ہو جانے والوں کی شادیِ مرگ کا بیان کر رہی تھی۔ جب سنبھلا تو میں اس سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگا۔

میں اپنے معاملات کی طرف سے بےپروا ہوگیا تھا۔ اب میں پرانے دوستوں سے ملنے اور پرانے رشتوں کو بحال کرنے لگا۔ مجھے ایک پرانی محبوبہ ملی ۔ اسے اپنے راز کو راز رکھنے کی قسم دلا کر میں نے لہر کی ساتھ اپنی زندگی کا احوال سنایا۔ عورتوں کو کوئی چیز اتنا متاثر نہیں کرتی جتنا کہ ایک مرد کو بچانے کا امکان۔ میری شفاعت کنندہ نے اپنے فن کے تمام حربے آزما لیے، مگر ایک عورت، روحوں اور جسموں کی ایک محدود تعداد پر قادر، بھلا میری رفیقہ کے سامنے کیا کر سکتی تھی، جو دم بہ دم بدلتی رہتی تھی، اور اپنی اس ان انت کایاکلپ میں ہمیشہ اپنے آپ سے مشابہ رہتی۔

جاڑا آیا۔ آسماں سُرمگیں ہو گیا۔ شہر پر کہرا گرنے لگا۔ جمی ہوئی پھوار برسنے لگی۔ میری رفیقہ ہر رات گریہ کرتی۔ دن میں اس نے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ کر لیا، خاموش

Scanned with CamScanner

اور پُرخطر، محض ایک کلمہ دہراتی ہوئی، کونے کونے بڑبڑانے والی بڑھیا کی طرح۔ وہ سرد پڑ گئی، اس کے ساتھ سونے کا مطلب تھا رات بھر کپکپانا اور دھیرے دھیرے اپنے لہو، اپنی ہڈیوں اور اپنے خیالات تک کو منجمد ہوتے ہوئے محسوس کرنا۔ وہ گہری ہو گئی، ناقابل گزر، بےقرار۔ میں اکثر چلا جاتا، اور میری غیرحاضری کے وقفے طویل تر ہونے لگے۔ وہ اپنے کونے میں بیٹھ کر واویلا کرتی۔ فولاد کے سے دانتوں اور تیزاب کی طرح گلا دینے والی زبان سے وہ دیواروں کو کترنے لگی، انھیں کھوکھلا کر دیا۔ وہ راتیں عزاداری میں گزارتی، مجھے ملامت کرتی جاتی۔ اسے بدخواب نظر آتے، دھوپ بھرے ساحلوں اور سورج کے بھیانک خواب، جن سے اسے ہذیان ہونے لگتا۔ وہ قطب شمالی کا سپنا دیکھا کرتی کہ برف کی سِل بن جائے، اور مہینوں لمبی راتوں میں سیاہ آسماں کے نیچے بہتی جائے۔ وہ میری توہین کرتی، کوستی کاٹتی اور ٹھٹھا اڑاتی، سارے گھر کو استہزا اور بھوت پریت سے بھر دیتی۔ وہ گہرائیوں کے بھوت بلاتی، اندھے، تیز رفتار، ٹھس بھوت۔ بجلی سے بھر جاتی، اور جس چیز کو چھوتی اسے کاربنائز کر دیتی۔ اس کی میٹھی ہم آغوشیاں گرہوں والے پھندے بن گئے جن سے میرا دم گھٹنے لگا۔ اور اس کا بدن، سبزگوں اور لچک دار، ایک تازیانہ بن گیا جو بار بار چوٹ لگاتا، چوٹ لگاتا۔ میں بھاگ نکلا۔ وہ بھیانک مچھلیاں ہولناک مسکراہٹ کی نمائش کرتی رہیں۔

وہاں پہاڑوں پر جا کر، سرو کے درختوں اور کھائیوں کے درمیاں، میں نے ٹھنڈی اور ہلکی ہوا میں سانس لیا، جو آزادی کے خیال ایسا تھا۔ مہینہ بھر بعد میں لوٹ آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اتنی سردی پڑی تھی کہ آتش داں کے سنگِ مرمر پر، مردہ آگ کے پاس، مجھے برف کا ایک مجسمہ ملا۔ میں اس کے درماندہ حُسن سے متاثر نہیں ہوا۔ میں نے اسے چرمی تھیلے میں بھر لیا اور اپنے کاندھے پر لاد کر باہر سڑک پر نکل آیا۔ مضافاتِ شہر کے ایک طعام خانے میں اپنے واقف کار بیرے کے ہاتھ فروخت کر دیا، جو فوراً اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا، جنھیں اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ ان بالٹیوں میں بھر دیا، جن میں بوتلیں یخ بستہ کی جاتی ہیں۔

(مسہاتوق)

انگریزی سے ترجمہ : آصف فرّخی

اوکتاویو پاز
(Octavio Paz)

لاطینی امریکا کے ممتاز ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ۱۹۱۴ میں میکسیکو سٹی میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں لکھنے کا آغاز کیا۔ میکسیکو کی وزارتِ خارجہ سے وابستہ ہونے کے سبب فرانس سمیت بہت سے ملکوں میں مقیم رہے۔ ۱۹۶۲ میں بھارت میں میکسیکو کے سفیر مقرر ہوئے، اور ۱۹۶۸ میں میکسیکو سٹی میں حکومت کے ہاتھوں طلبا کے قتلِ عام پر احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گئے۔ میکسیکو سٹی سے آرٹ، ادب اور سیاست پر مبنی ایک ماہانہ جریدہ شائع کرتے ہیں۔ پاز کی نظم و نثر کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے نظموں کے علاوہ تنقید، بشریات، جمالیات اور سیاسی موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔

یہودا امیحائی

بم کا قطر

بم کا قطر تیس سینٹی میٹر
اور اس کی کارکردگی کا قطر
تقریباً سات میٹر تک پھیلا ہے
اور اس میں چار ہلاک اور گیارہ زخمی ہیں
اور اس کے گرد وقت اور درد کے ایک بڑے دائرے میں
دو ہسپتال اور ایک قبرستاں ہے
مگر ایک سو کلومیٹر دور سے آئی ہوئی
نوجواں لڑکی
جو وہاں دفن ہے
دائرے کو اور وسیع کر دیتی ہے
اور وہ آدمی جو ایک دور اُفتادہ ملک کے ایک گوشے میں
اُس کی موت پر آنسو بہاتا ہے
ساری دنیا کو
دائرے میں شامل کر دیتا ہے

میری سابقہ طالبِ علم

میری سابقہ طالبِ علم ٹریفک کی سپاہی بن گئی ہے

Scanned with CamScanner

وہ شہر کے چوک پر کھڑی ہے
وہ خوشبوؤں اور چہرے کی آرائش کے سامان کے بکس کی طرح
ایک دھات کا بنا ہوا بکس کھولتی ہے
اور ٹریفک لائٹ کا رنگ
اپنے مُوڈ کے مطابق تبدیل کرتی ہے
اس کی آنکھیں سبز، سرخ اور زرد رنگوں کا مجموعہ ہیں
اس کے بال تازہ بازاری لونڈوں کی طرح چھوٹے کٹے ہیں
لمبے سیاہ جوتے پہنے وہ بکس سے ٹیک لگائے کھڑی ہے
اس کا اسکرٹ اونچا اور تنگ ہے
میں اس سنہری جلد کے بالائی حصّے کے تمام حسن کا تصوّر کرنے کی ہمت نہیں رکھتا

اب میری سمجھ میں نہیں آتا، میں راستا بھول چکا ہوں
نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کا پورا دستہ
بڑھتی ہوئی موجوں کی طرح مجھ سے ٹکراتا ہے
ان کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والی قوت ہے
اور میری طالب علم، ٹریفک پولیس کی لڑکی
انہیں روکنے کی اہلیت نہیں رکھتی
وہ ان میں شامل ہو جاتی ہے

ڈینس بہت بیمار تھا

ڈینس بہت بیمار تھا
اس کا چہرہ پسپا ہو گیا تھا
مگر اس کی آنکھیں وہاں سے بڑی ہمت کے ساتھ پیش قدمی کر رہی تھیں
جیسے کسی جنگ میں تازہ کُمک
مار کھائی ہوئی پسپا صفوں کے درمیان سے
محاذ کی طرف راستا بناتی ہے

اُس کو جلد صحت یاب ہونا ہے
وہ ہمارے بینک کی طرح ہے
جس میں ہم نے اپنے دل کا سب کچھ جمع کرا دیا ہے

وہ سوئٹزر لینڈ کی طرح
بینکوں سے بھرا ہوا ہے

ہلکا سا لرزتا ہوا
وہ ایک سکریٹ پی رہا ہے
اور جیسا کہ ہر حقیقی شاعر کے ساتھ ہوتا ہے
وہ جلی ہوئی تیلیاں
ڈبے میں واپس رکھ رہا ہے

پرچم کیسے بنا

پرچم کیسے بنا
فرض کر لیتے ہیں ابتدا میں یہ ایک تھا
پھر اسے پھاڑ کر دو حصّے کر دیے گئے
اور دونوں دو مخالف لشکروں کے لیے کافی ہو گئے

یا میرے بچپن کے غیرآباد حقیر باغ میں
ساحلی کرسی کا دھاری دار پھٹا کپڑا
ہوا میں لہراتا ہوا
ایک پرچم ہی سکتا ہے
جو تمہیں اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر دے
یا اپنے نیچے ماتم کرنے دے
یا اس سے عُذرداری کرنے دے
یا اسے بھول جانے دے

میں نہیں جانتا، میری جنگوں میں کوئی پرچم اٹھانے والا
دھول اور دھوئیں کے بادل میں خاک آلود سپاہیوں کے سامنے سے نہیں گذرا
میں نے چیڑوں کو چشمے کی طرح پھوٹتے اور
زرد ٹیلوں میں تیزی کے ساتھ پسپائی کرتے ہوئے پایا
اب میں ان تمام سے بہت دور ہوں، اُس آدمی کی طرح
جو پل کے درمیان دونوں کناروں کو بھول جاتا ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

اور وہاں ریلنگ پر جھکا، بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے کے لیےکھڑا رہتا ہے
یہ بھی ایک پرچم ہے

وہ مکان جس میں مَیں نے کئی خواب دیکھے

وہ مکان جس میں میں نے کئی خواب دیکھے
جب میں جواں تھا
گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے

اب میرے خواب دنیا میں آزاد ہو گئے ہیں
اور مجھے خطرے میں ڈالتے ہیں

میں جگہ جگہ بھٹکتا ہوں اور مکاں بدلتا ہوں
کہ وہ مجھے نہ ڈھونڈ سکیں
"کیا وہ پہنچ گیا ہے" اور "کیا وہ اب تک یہاں ہے"
دو سوالوں کے درمیاں سے
میں ہمیشہ نئے مقامات کے لیے نکل جاتا ہوں

میں تمام شکار شدہ، گرفتار، ذبح کیے ہوئے
مارے جانے سے پہلے فروخت شدہ،
کڑوے نمک سے حلال کیے ہوئے،
کاٹے ہوئے اور اذیت پہنچائے ہوئے گوشت کے راستوں سے گزروں گا
میرے پاس ایک اجنبی زندگی ہے
اور ایک اجنبی موت
اور ایک اجنبی قبر
جس کے کتبے پر کھدائی کی غلطیاں ہیں

جو لوگ اپنا گھر چھوڑتے ہیں

جو لوگ اپنا گھر چھوڑتے ہیں

اس کو دعا مانگنے کی جگہ میں تبدیل کر دیتے ہیں
اس کا دروازہ بھاری لکڑی سے بنا ہے، جس میں مضبوط چٹخنی لگی ہے
مگر اس کی کھڑکیاں بڑی اور مخدوش ہیں
میز پر بال جھاڑنے کے برش میں ایک کنگھی پھنسی ہے
محبت میں دو گرفتاروں کی واحد یاد گار
ایک کتاب کے صفحے پر نشان لگانے والا کاغذ، مگر کوئی کتاب نہیں ہے
ایک آئینہ، اور کوئی چہرہ نہیں ہے
مگر تمہارا نام ہے

میں یہاں تمباکو نوشی کر رہا ہوں ڈائنی
تمہارے کائج میں، تاکہ دھواں دراڑوں میں ٹھہر سکے
کیونکہ میرے الفاظ نہیں ٹھہریں گے

بہت سے رنگوں کے گل دستے کی طرح
اب تمہارے کئی ٹھکانے ہیں
تم اس موسم میں ہو، جس میں شکار غیرقانونی ہے
تم سے محبت کرنا
اور اب تمہاری تلاش بھی ممنوع ہے

ہم ایک دوسرے سے اتنی دور ہیں
تم بھی مسیح سے قبل یا بعد
بلکہ الگ اور اپنے طور پر زندہ رہتی ہو
پہلی محبت کی سخت گیری کے ساتھ، جو
تمہاری بقیہ زندگی کا تعیّن کر دیتی ہے
"چونکہ بارش اور برف آسمان سے گرتی ہیں
وہ پھر کبھی وہاں واپس نہیں جاتیں"
وہ آئیں گی اور واپس چلی جائیں گی
اس وقت لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا

اُن دنوں میں جب تمہارا ماضی میرا آنے والا وقت ہی جائے گا
ہم دونوں الگ الگ خوبصورت ہوں گے، ڈائنی
ہم تمہارے وطن کے بہتے ہوئے پانی
اور میرے پھیلے ہوئے صحرا کی طرح خوبصورت ہوں گے

rekhta

Scanned with CamScanner

زندگی میں بعد از وقت

زندگی میں بعد از وقت
کئی دروازوں سے چھنتے
سیڑھیوں سے گھنٹے ہوئے
میں جب تم تک پہنچا
مجھ میں شاید ہی کچھ بچ گیا ہو

تم اتنی عجیب عورت ہو
آدھی ہمّت کے ساتھ زندہ رہتی ہو
تم ایک وحشی عورت ہو
جو اپنی آنکھوں کی باگیں خوش پوش بنانے کے لیے
چشمہ پہنتی ہے

"چیزیں کھو جایا کرتی ہیں
اور چاہتی ہیں کہ دوسرے انہیں ڈھونڈ لائیں۔
صرف آدمی خود کو تلاش کرنے سے محبت کرتا ہے"
تم نے کہا

اس کے بعد تم نے اپنا پورا چہرہ
دو یکساں پروفائلوں میں توڑ دیا،
پہلا دور فاصلوں کے لیے
دوسرا ایک یادگار کے طور پر میرے لیے
اور تم چلی گئیں

تم سیب کے اندر مجھ سے مِلنے آتی ہو

تم سیب کے اندر مجھ سے ملنے آتی ہو
ہم
محتاط طور پر گردش کرتے ہوئے
چاقو کی آواز

ایک ساتھ سَی سکتے ہیں

تم مجھ سے باتیں کرتی ہو
مجھے تمہاری آواز میں یقیں ہے
اس میں سخت تکلیف کے سنکریزے شامل ہیں

میں تمہارے ہونٹوں کو چھوتا ہوں
اور تمہارے ہونٹ سُرخ ہیں

تم سیب کے اندر مجھ سے ملنے آتی ہو
تم سیب کے اندر میرے ساتھ رہو گی
جب تک چاقو اپنا کام
ختم نہیں کر لیتا

(عبرانی)
انگریزی سے ترجمہ : افضال احمد سید

ooooo

ہماری محبت کے عرصے میں

ہماری محبت کے عرصے میں مکانوں کی تعمیر مکمل ہو گئی
اور کوئی، جس نے تب سیکھنا شروع کیا تھا، بانسری بجانا سیکھ ؟
اس کے سُر چڑھتے اور اترتے
اب تم سی سکتی ہو
جب ہم ایک دوسرے کو یوں نہیں بھرتے
جیسے چڑیاں پیڑ کو بھر دیتی ہیں
اور تم بیبسی کے عالم میں سکّے تبدیل کرتی چلی جا رہی ہو
ایک ملک سے دوسرے ملک میں
ایک خواہش سے دوسری خواہش میں

اور اگرچہ ہم نے سب کچھ بہت دیوانگی سے کیا

Scanned with CamScanner

لیکن اب لگتا ہے کہ ہم معمول سے بہت نہیں ہٹے
بہت ہلچل نہیں مچا سکے
دنیا میں، اس کے لوگوں میں، ان کی نیند میں---

اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے
بہت جلد ہم دونوں میں سے کوئی بھی
دوسرے کو بُھلانے کے لیے باقی نہیں رہ جائے گا

ہمارے جسموں کے نشان کی طرح

ہمارے جسموں کے نشان کی طرح
ہمارے اس جگہ ہونے کا کوئی نشان نہیں رہے گا
دنیا ہمارے پیچھے بند ہو جائے گی
ریت خود کو ہموار کر لے گی

وہ دن ابھی سے نظر آ رہے ہیں
جن میں تمہارا وجود نہیں
ہوا ابھی سے وہ بادل لا رہی ہے
جو ہم دونوں پر نہیں برسیں گے

اور تمہارا نام ابھی سے جہازوں کے مسافروں کی فہرست میں درج ہے
اور ان ہوٹلوں کے رجسٹروں میں
جن کے نام ہی دل دہلا دیتے ہیں
وہ تینوں زبانیں جو مجھے آتی ہیں
سارے رنگ جو میں جاگتے میں اور خواب میں دیکھتا ہوں
کوئی میری مدد نہیں کرے گا

بہت دنوں سے کوئی نہیں پوچھتا

بہت دنوں سے کوئی نہیں پوچھتا

کہ ان مکانوں میں کون رہتا تھا، اور کون آخری بار بولا تھا
کون اپنا اوورکوٹ ان گھروں میں بھول گیا تھا
اور کون یہیں ٹھہر گیا تھا(اور وہ بھاگا کیوں نہیں)

ایک سوکھا پیڑ بُور لاتے پیڑوں کے بیچ کھڑا ہے
ایک مردہ پیڑ
یہ ایک پرانی بُھول ہے جسے کبھی سمجھا نہیں گیا
ملک کے سِرے پر شروع ہوتا ہوا کسی اَور کا وقت
ایک مختصر سی خاموشی
اور جسموں کی دیوانگی اور دوزخ
اور سرگوشیوں میں سفر کرتا ہوا خاتمے کا خاتمہ

کبھی ہوا یہاں سے گزرتی تھی
اور ایک گمبھیر کتّا انسانوں کو ہنستے دیکھتا تھا

بَیل گھر لوٹتا ہے

بَیل رنگ میں اپنے دن بھر کے کام کے بعد گھر لوٹتا ہے
اپنے فائٹروں کے ساتھ کافی پی کر
اور اپنے درست پتے کے ساتھ ان کے لیے ایک رقعہ چھوڑ کر
اور سرخ رومال رکھنے کی جگہ بتا کر
(تلوار اس کی اکڑی ہوئی گردن میں گڑی ہوئی ہے
اور گڑی رہتی ہے)
اب وہ اپنے گھر میں ہے
اور اپنی بھاری یہودی آنکھیں لیے اپنے بستر پر بیٹھا ہے
اسے معلوم ہے
گوشت میں اترتے ہوئے تلوار کو بھی اذیّت ہوتی ہے
اگلے جنم میں وہ ایک تلوار ہو گا
اذیّت باقی رہے گی
("دروازہ کھلا ہے،
اگر نہ ہو تو چابی دری کے نیچے ہو گی")

rekhta

Scanned with CamScanner

وہ شام کی مہربانی سے واقف ہے
سچی مہربانی سے
انجیل میں اسے پاک جانوروں میں شامل کیا گیا ہے
وہ حلال گوشت ہے اور اپنی جگالی کرتا ہے

اس کا دل بھی ہرنگ کی طرح دو شاخہ
اور بیچ سے چرا ہوا ہے
باہر اس کے سینے پر بال اگے ہیں
خشک اور مٹیالے بال
پھٹی ہوئی دری کے دھاگوں جیسے

اونچی ایڑی کے جوتے

زمیں نے کئی بار جواب دیا،
اندر آ جاؤ!
جب تم اونچی ایڑی کے جوتوں سے کھٹکھٹاتی
سڑک پار کر رہی تھیں
اس نے کئی بار کہا،
اندر آ جاؤ!
لیکن تم نے سنا نہیں

میدانِ جنگ پر بارش

پانی میرے ساتھیوں کے چہروں پر پڑ رہا ہے
میرے زندہ ساتھیوں کے چہروں پر
جنھوں نے اپنے سروں پر کمبل اوڑھ رکھے ہیں
اور پانی میرے مرے ہوئے ساتھیوں کے چہروں پر پڑ رہا ہے
جنھوں نے کچھ نہیں اوڑھ رکھا

خدا کی تقدیر

خدا کی تقدیر اب
درختوں، پتھروں، سورج اور چاند کی تقدیر ہے
جنھیں پوجنا بند کر دیا گیا
جب وہ ایک خدا پر ایمان لے آئے

لیکن وہ ہمارے ساتھ رہنے پر اسی طرح مجبور ہے
جیسے درخت، جیسے پتھر
سورج، چاند اور ستارے

ایک بار

ایک بار میں بھاگ نکلا تھا
مجھے یاد نہیں کیوں اور کس خدا سے
سو مجھے اپنی زندگی میں یوں سفر کرنا ہے
جیسے یونس نے اپنی اندھیری مچھلی میں کیا تھا
میرے اور مچھلی کے درمیاں یہ طے پا چکا ہے
ہم دونوں دنیا کی آنتوں میں ہیں
میں باہر نہیں نکلوں گا
وہ مجھے ہضم نہیں کرے گی

جاسوس

بہت برسوں پہلے
مجھے اس سرزمیں میں بھیجا گیا تھا
جو تیس برس کی سرحد کے اس پار ہے

لیکن میں وہیں رہ گیا

rekhta

Scanned with CamScanner

اور اپنے بھیجنے والے کے پاس واپس نہ گیا
تاکہ مجھے اس علاقے کے بارے میں بتانا نہ پڑے
اور جھوٹ نہ بولنا پڑے

وہ مجھے بلاتے ہیں

نیچے ٹیکسیاں
اور اوپر فرشتے
دونوں بےصبری سے
ایک ساتھ مجھے پکارتے ہیں
میں آ رہا ہوں
آ رہا ہوں
آ رہا ہوں نیچے
آ رہا ہوں اوپر

میں جس شہر میں پیدا ہوا

میں جس شہر میں پیدا ہوا وہ بارود سے تباہ ہو گیا ہے
جس جہاز نے مجھے اپنے وطن پہنچایا وہ بعد کی کسی جنگ میں ڈوب گیا
حمّادیہ کے جس گودام میں میں نے محبت کا وقت بسر کیا وہ جل چکا ہے
منہائی کی دکان کو دھماکے سے اڑا دیا گیا
اسماعیلیہ کا وہ پل جسے میں ہجر کی راتوں میں بےتابی سے پار کرتا رہتا تھا
ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا

اس طرح میری زندگی میرے پیچھے ایک قطعی نقشے کے مطابق مٹائی جاتی رہی ہے
میری یادیں کب تک مستحکم رہ سکتی ہیں
میرے بچپن کی ساتھی لڑکی کو مار دیا گیا
اور میرا باپ چل بسا

اس لیے تمھیں عاشق، یا بیٹے،

یا پل پار کرنے والے،
یا شہری، یا کرایہ دار کے طور پر
میرا انتخاب نہیں کرنا چاہیے

میرے پاس جنگ کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں

میرے پاس جنگ کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں
مجھے کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے، میں شرمندہ ہوں

جو علم میں زندگی بھر جذب کرتا رہا
اب اس سے دست بردار ہوتا ہوں، جیسے صحرا
جس نے پانی کے ہر قطرے کو ترک کر دیا ہو
وہ نام جنھیں بھولنے کا میں تصور نہیں کر سکتا تھا
اب بھولتے جا رہے ہیں،

اور جنگ ہی کی وجہ سے
ایک آخری اور سادہ مسرت کی خاطر میں دوہراتا ہوں،
سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، ہاں
زمین ایک راہ بھٹک کر بہتے ہوئے تختے کی طرح ہموار ہے، ہاں
خدا عرش پر ہے، ہاں

(عبرانی)
انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

یہودا امیحائی (Yehuda Amichai)

۱۹۲۴ میں ورسبرگ، جرمنی میں پیدا ہوئے۔ روایتی یہودی ماحول میں پرورش پائی اور مذہبی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۶ میں اپنے خاندان کے ساتھ فلسطین منتقل ہو گئے۔ امیحائی کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۵ میں شائع ہوا، اور اس کے بعد نظموں کے متعدد مجموعوں کے علاوہ ناول، کہانیاں اور ڈرامے بھی چھپ چکے ہیں۔ اسرائیل کے نمایاں ترین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

rekhta

Scanned with CamScanner

جولین بارنز

ایما بوواری کی آنکھیں

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مجھے نقادوں سے کیوں نفرت ہے۔ عادی وجوہ کی بنا پر نہیں، کہ یہ ناکام تخلیق کار ہیں (عام طور پر نہیں ہوتیا ناکام نقاد تو ہو سکتے ہیں، لیکن یہ الگ بات ہے)، یا یہ کہ طبعاً خوردہ گیر، حاسد اور خودپسند ہوتے ہیں (عام طور پر نہیں ہوتیا بلکہ اُن پر تو ضرورت سے زیادہ فیّاض ہونے کا الزام دھرنا زیادہ مناسب ہو گا، یہ شہرتوں کو آسماں پر چڑھا دیتے ہیں، صرف اِس لیے کہ خود اُن کے باریک بیں امتیازات نادرتر نظر آنے لگیں)۔ نہیں بھئی، میں جس وجہ سے نقادوں سے نفرت کرتا ہوں -- خیر، بعض اوقات ہی سہی --- تو وہ اِس لیے کہ وہ اِس قسم کے جملے لکھتے ہیں؛

> فلوبیر اپنے کرداروں کی تعمیر اِس طرح نہیں کرتا جس طرح بالزاک کرتا تھا۔ معروضی اور خارجی بیاں کے ذریعیا سچ تو یہ ہے کہ وہ اُن کے ظاہری حلیے کے معاملے میں اِس قدر بےپروا واقع ہوا ہے کہ ایک موقعے پر وہ ایما کی آنکھوں کا رنگ بُھورا دکھاتا ہے (۱۴)، ایک اور موقعے پر گہرا سیاہ (۱۵)، اور ایک اور موقعے پر نیلا (۱۶)۔

یہ بےکم و کاست اور مایوس کی فردِ جرم مرحوم ڈاکٹر اینڈ سٹارکی (Enid Starkie) نے لگائی ہے، جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں فرانسیسی ادب کی ریڈر امیریٹس اور فلوبیر کی متبحّر ترین انگریز سوانح نگار ہیں۔ متی میں جو نمبر شمار ہیں وہ اُن فٹ نوٹس کی طرف لے جاتے ہیں جن میں اُنھوں نے باب اور سطروں کے نمبر دے دے کر گویا ناول نگار کو اپنے نیزے کی اَنی سے گود کر رکھ دیا ہے۔

ایک بار مجھے ڈاکٹر سٹارکی کو سُننے کا اتفاق ہوا، اور مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ (بحمد اللہ) اُن کی فرانسیسی لہجے کی ادائیگی نہایت زِشت تھی؛ بس ویسی ہی ادائیگی جو مدرسہ زناں کے زائیدہ اعتماد کی غمّاز، اور اُس استناد سے تہی ہوتی ہے جو زباں کو گوش کے ذریعے سیکھنے سے آتا ہے، جو روزمرّہ کی درستیِ زباں، اور نقّالی سے پیدا ہونے والی غلطی کے درمیاں ڈگمگاتی رہتی ہے، اور اکثر دونوں محض ایک ہی لفظ میں۔ لیکن اِس سے، ظاہر ہے، آکسفورڈ میں درس و تدریس کی اُن کی اہلیت کو کوئی گزند نہیں پہنچتی، کیونکہ یہ دانش گاہ ابھی حال تک زندہ زبانوں کو بھی اس طرح برتتی رہی ہے جیسے مردہ زبانوں کو؛ اس طرح وہ کچھ زیادہ باوقار نظر آنے لگتی ہیں، لاطینی اور یونانی کے دور دراز کمال سے زیادہ مشابہ۔ تاہم مجھے یہ بات خاصی عجیب لگی کہ کوئی شخص جو اپنے نانِ نفقے کے واسطے فرانسیسی ادب کا رہینِ منّت ہو، وہ اس زباں کے بنیادی الفاظ کو اُسی طرح ادا کرنے سے اس بھیانک درجہ قاصر رہے جس طرح اُس کے موضوع، اُس کے ہیروز نے (بلکہ اگر آپ چاہیں تو، اُس کے تنخواہ دینے والوں نے) انہیں اوّل اوّل ادا کیا تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ ایک مرحوم خاتون نقّاد سے کیا رکیک بدلہ لے رہا ہے، اور وہ بھی صرف اِتنے سے جرم کی پاداش میں کہ اُس نے اس طرف توجّہ دلائی کہ فلوبیر کو ایما بوواری کی آنکھوں کا قابل اعتماد علم نہ تھا۔ لیکن اب میں "مرے ہوؤں کے بارے میں خوش گفتار رہو" کا، بہرحال، قائل نہیں (ظاہر میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جو بات کر رہا ہوں)؛ پھر اگر کوئی اس قسم کی چیز کی طرف آپ کی توجہ دلائے تو اِس پر جتنا برہم ہوا جائے، کم ہے۔ یہ برہمی ڈاکٹر سٹارکی پر نہیں، کم از کم شروع میں نہیں -- وہ تو، جیسا کہ عام محاورہ ہے، محض اپنا فرض ادا کر رہی تھیں -- بلکہ فلوبیر پر۔ محنتِ شاقّہ کے عادی اس عبقری سے اِتنا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے مشہور ترین کردار کی آنکھوں کا رنگ پورے ناول میں ایک جیسا ہی رکھتا؟ ہا۔ اور پھر، تادیر اُس سے تُرش روی برتنے کا یارا نہ پا کر آپ اپنے (برافروختہ) جذبات کا رخ نقّاد کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ جتنی بار بھی "مادام بوواری" پڑھی، ہیروئن کی دھنک آنکھوں کی طرف سرے سے کبھی توجّہ ہی نہ دی۔ دینی چاہیے تھی؟ آپ دیتے؟ کیا میں اُن دوسری چیزوں پر توجہ دینے میں ضرورت سے زیادہ منہمک تھا جو ڈاکٹر سٹارکی کی نظروں سے خطا جا رہی تھیں (گو اُس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہو سکتی تھیں)؟ بہ الفاظِ دیگر، کیا کہیں کوئی مثالی، مکمّل قاری موجود ہے؟ کیا ڈاکٹر سٹارکی نے جس طور "مادام بوواری" پڑھا، اُس میں وہ تمام تاثرات آ جاتے ہیں جو اس کو پڑھتے وقت مجھ میں پیدا ہوئے، اور اُن کے علاوہ کثیر مقدار میں بہت کچھ اَور بھی، جس کے نتیجے میں میرا مطالعہ بےمعنی قرار پائے؟ نہیں بھئی، خدا نہ کرے! میرا مطالعہ ادبی تنقید کی تاریخ کی رُو سے تو بےمعنی ہو سکتا ہے، کتاب سے لطف اندوز ہونے کے لحاظ سے بالکل نہیں۔ اب میں یہ تو نہیں ثابت کر سکتا کہ بےتربیت قاری، پیشہ ور نقادوں کے مقابلے میں، خط اٹھانے کی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے، لیکی

Scanned with CamScanner

میں آپ کو اُس ایک فوقیت کے بارے میں ضرور بتا سکتا ہوں جو ہمیں اُن پر حاصل ہے۔ ہم بھول سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سٹارکی اور اُن کے قبیلے والوں کے ساتھ حافظے کی لعنت لگی ہوئی ہے۔ یہ جو کتابیں پڑھاتے ہیں، اور جن کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں، وہ ان کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔ یہ ان کا کنیاکٹم ہی جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے بعضے بعضے نقاد اپنے موضوع کے حق میں دبا دبا سا سرپرستانہ لب ولہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا طرزِ عمل کچھ یوں ہوتا ہے جیسے فلوبیر یا ملٹن یا ورڈزورتھ جھولا کرسی میں ہنکورے لیتی ہوئی کوئی سالخوردہ، اُکتا دینے والی خالہ رہے ہوں، جس سے باسی پاؤڈر کے بھبھکے اُٹھ رہے ہوں، اور جو ماضی کی بازخوانی کے سوا اور کسی چیز میں دلچسپی نہ رکھتی ہو، اور جس نے سالہاسال سے کوئی نئی بات نہ کہی ہو۔ جی ہاں، اس میں کیا کلام کہ گھر خالہ ہی کا ہے، اور جس کو دیکھیے بلاکراہ اس میں دھرنا دیے بیٹھا ہے، تاہم، سچ یہ ہے کہ، آپ بہرحال جانتے ہی ہیں --- وقت قریب ہے۔

اس کے برعکس، ایک عام لیکن پُرشوق و جوش قاری کو بھولنے بھلانے کا ادنیٰ عام ہیا وہ اُٹھ کر جا سکتا ہے، وفاداری کے تقاضوں کو بالائےطاق رکھ کر دوسرے لکھنے والوں سے ملوّث ہو سکتا ہے، لوٹ کر آ سکتا ہے، اور باردگر فن پارے میں محو اور بےخود ہو سکتا ہے۔ خانگی زندگی کو اس رشتے میں مخل ہونے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی؛ یہ رشتہ متفرق الاوقات تو ہو سکتا ہے، لیکن جب بھی وقوع پذیر ہو جائے، ہمیشہ ہی بڑا شدید ہوتا ہے۔ اس میں روز مرّہ والا بُغض و عناد نہیں ہوتا، جو لوگوں میں ڈھور ڈنگروں کی طرح ساتھ جیسے جیسے زندگی کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو کبھی فلوبیر کو، تھکی سے چُور آواز میں، اس یاددہانی کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ بھئی ہاتھ مَیٹ کو قرینے سے لٹکا دیا ہوتا، یا ٹائلٹ کو بعد از استعمال برش سے صاف کر لیتے۔ لیکن بس یہی ڈاکٹر سٹارکی کرنے سے باز نہیں رہنے والیں۔ دیکھیے، میں چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، ادیب کامل یا "بےعیب" نہیں ہوتے، جس طرح عام زن و شو نہیں ہوتے۔ اگر کوئی اصول یقینی ہو سکتا ہے تو وہ بس یہ ہے؛ اگر "بےعیب" نظر آئیں، تب بھی نہیں ہوتے۔ میں نے اپنی بیوی کو کبھی "بےعیب" نہیں خیال کیا تھا۔ مجھے اُس سے محبت تھی، لیکن میں نے خود کو کسی فریب میں نہیں آنے دیا۔ مجھے یاد آتا ہے --- لیکن میں یہ کسی اور موقعے کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔

اس کے بدلے مجھے ایک اور لیکچر یاد کرنا چاہیے جس میں مَیں سامع کی حیثیت سے شریک تھا، چند سال پہلے، چلتنہم (Cheltenham) کے ادبی میلے میں، یہ لیکچر کیمبرج کے ایک پروفیسر صاحب، بنام کرسٹوفر رکس (Christopher Ricks) نے دیا تھا۔ یہ ایک بڑی منیاپش پرفارمینس تھی؛ اُن کی چندیا بھی چمکدار، کالے کفش پا بھی چمکدار، اور لیکچر بھی، ظاہر ہے، بےحد چمکدار۔ موضوع تھا؛ " ادب میں غلطیاں، اور کیا یہ واقعی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں"۔ یوتو شینکو (Yevtushenko)، مثلاً، امریکی بلبلوں کے بارے میں اپنی ایک نظم میں بڑی بھاری غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ رقص کے موقعے پر جو فوجی لباس پہنا جاتا ہے، اُس کے بارے میں پشکن سے شدید غلطی ہوئی تھی۔ جان وین ہیروشیما پر بم گرانے والے ہوا باز کے

بارے میں غلط تھا۔ نبکوف (Nabokov) -- یاعجبا! -- لولیتا کے ذم کی صوتیات کے بارے میں غلطی پر تھا۔ چند اور مثالیں بھی تھیں؛ کولرج، ییٹس، اور براؤننگ اُن میں سے چند تھے جو "ہاک" اور "ہینڈ سا" (hawk and handsaw) کے فرق سے قطعی لاعلمی کے عالم میں پکڑے گئے تھے، یا یہی کہ " ہینڈ سا" ہوتا کیا بلا ہے۔

دو مثالیں، خاص طور پر، میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئیں۔ پہلی *Lord of the Flies* کے بارے میں بڑی قابلِ لحاظ دریافت تھی۔ اُسی مشہور منظر میں، جس میں پگی (Piggy) کی عینک آگ کی دریافتِ نو کے واسطے استعمال ہوتی ہے، ولیم گولڈنگ کا علمِ بصریات (Optics) بالکل اُلٹ پلٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ پگی نزدیک بیں ہے؛ اس عارضے کے واسطے جس قسم کے عدسوں والی عینک تجویز ہوتی ہے اُس سے آگ سُلگانے کا کام سرے سے لیا ہی نہیں جا سکتا۔ آپ چاہے جس زاویے سے اسے استعمال کرتے، یہ سورج کی شعاؤں کو ایک نکتے پر شدّت کے ساتھ مرتکز کرنے سے عاجز ہی رہتی۔

دوسری مثال کا تعلق ٹینی سن کی Charge of the Light Brigade سے تھا۔

Into the valley of death / Rode the six hundred

ٹینی سن نے یہ نظم بہت عُجلت میں کہی تھی، "دی ٹائمز" میں ایک رپورٹ پڑھنے کے بعد، جس میں یہ فقرہ بھی شامل تھا، "کسی سے بڑی فاش غلطی ہوئی تھی"۔ اس نے ایک سابقہ بیان پر بھی اعتماد کیا، جس میں "۶۰۷ (خمدار) تلواریں" مذکور تھیں۔ بہرحال، بعد میں اس معرکے میں -- جیسے کمیل رُوسے (Camille Rousset) نے "یہ بھیانک اور خونیں کہانی باز گھڑدوڑ" کے الفاظ مَیں بیان کیا ہے -- حصہ لینے والوں کی تعداد میں سرکاری طور پر تصحیح کر کے اسے ۶۷۳ مقرر کیا گیا۔

Into the valley of death / Rode the six hundred and seventy-three?

لیکن مصرعے میں وہ غنائی آہنگ کہاں! تو تعداد کو سات سو کر لینے سے شاید کام چل جائے؟ --- لیکن یہ بھی کہاں بالکل درست ہے؟ خیر، بالکل نہ سہی، کم از کم مقابلتاً زیادہ درست تو ہے! ٹینی سن نے مسئلے پر غور و خوض کیا اور نظم میں تبدیلی نہ کرنے ہی کا فیصلہ کیا؛ "بحر کے اعتبار سے، چھ سو (جیسا کہ میرا خیال ہے) سات سو سے کہیں زیادہ بہتر ہے؛ چنانچہ برقرار رہنے دو۔"

"چھ سو تہتّر"، یا "تقریباً سات سو"، کے بجائے "چھ سو" کا استعمال میری دانست میں تو کوئی ایسی بات نہیں جسے "غلطی" سے متّصف کیا جا سکے۔ دوسری طرف، گولڈنگ کے علم بصریات میں جو کپکپاہٹ کا علم ہے، اسے ضرور "غلطی" کی صف میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے؛ تو کیا اس سے کوئی لمبا چوڑا فرق پڑ جاتا ہے؟ جہاں تک ڈاکٹر رکس کا لیکچر میرے حافظے میں تازہ ہے، تو ان کا دعوا تھا کہ اگر ادب کا امرِ واقعہ پہلو قابلِ اعتماد نہ رہے تو پھر "طنز" اور "فینٹسی" جیسی فنّی حکمت عملیوں سے کام لینا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو یہ نہیں معلوم کہ سچ کیا ہے، یا کیا ہونا چاہیے، تو پھر جو جھوٹ ہے، یا جو

Scanned with CamScanner

ہونا چاہیے، اس کی صحیح قدر و قیمت گھٹ کے رہ جاتی ہے۔ یہ دلیل، کم از کم مجھے تو، بڑی مستند نظر آتی ہے! گو میں یہ سوچنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ادبی سہو کے کتنے موقعے ایسے ہوں گے جن پر اس کا، فی الواقع، اطلاق ہو سکے۔ جہاں تک پگی کے چشمے کا تعلق ہے، تو میرے خیال میں (الف) چشمہ سازوں، معالجینِ چشم، اور چشمہ بردار پروفیسرانِ انگریزی سے قطع نظر، کم ہی لوگوں کی توجہ اس طرف جا سکے گی؛ اور (ب) اگر جائے بھی تو وہ "غلطی" کو بیاثر کر دیں گے — جس طرح کسی چھوٹے سے بم کو نگراں دھماکے کے ذریعے بےنیش کر دیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ بےنیشی (یا ڈیٹونیشن) کا یہ عمل (جو سمندر کے کسی اجاڑ سے کنارے کی ریت پر وقوع پذیر ہوتا ہے، جہاں گواہ کی حیثیت سے بس ایک کتا ہی موجود ہے) ناول کے بقیہ اجزا کو آگ نہیں لگا دیتا۔

غلطیاں، مثلاً جیسی کہ گولڈنگ نے کی ہے، "خارجی غلطیاں" ہوتی ہیں — اس تفاوت کی زائیدہ ہوتی ہیں جو کسی چیز کے بارے میں کتاب کے دعوے، اور حقیقت کے بارے میں ہمارے علم کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر یہ محض اس بات کی دلیل ہوتی ہیں کہ ادیب کسی علم سے متعلق مخصوص فنّی معلومات سے نابلد ہے۔ یہ گناہ بالکل قابلِ درگزر ہے۔ لیکن "داخلی غلطیوں" کے بارے میں کیا حکم دیا جائے، مثلاً جب ادیب اپنی نگارش میں دو ایسی باتوں کا دعوا کرے جو ایک دوسرے کی ضد ہوں، اور جن میں کوئی توافق نہ پایا جاتا ہو؟ ایما کی آنکھیں بھوری ہیں، ایما کی آنکھیں نیلی ہیں۔ آہ، یہ صرف نااہلیت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، اور ادبی پھوہڑپن کا۔ چند دن پہلے میں نے ایک ناول پڑھا جو ایک ادیب کی پہلی کاوش تھا، اور جس کی خوب تعریف بھی ہوئی تھی۔ اس کا راوی — جو جنسی اعتبار سے ناآزمودہ اور فرانسیسی ادب کا شوقیہ پرستار، دونوں ہی ہے — لڑکی کو جھڑکی کھائے بغیر چومنے کے بہترین طریقے کی پُر از مزاح آزمائشی مشق کرتا ہے، "آہستہ، شہوانی، ناقابلِ مدافعت طاقت سے (لڑکی کو) بتدریج اپنی طرف کھینچو اور، دریں اثنا، اُس کی آنکھوں میں یوں ڈوب کر دیکھو جیسے ابھی ابھی تمھیں "مادام بوواری" کے پہلے، اشاعت سے روکے ہوئے ایڈیشن کا ایک نسخہ تحفتاً ملا ہو"۔

مجھے محسوس ہوا کہ بات بڑے سلیقے سے ادا کی گئی تھی، بلکہ یقیناً بڑے پُرتفنن طریقے پر۔ لیکن چکّر یہ تھا کہ "مادام بوواری، کے پہلے، اشاعت سے روکے ہوئے ایڈیشن" جیسی کسی چیز کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ یہ ناول، جیسا کہ میرے خیال میں کم و بیش سبھی جانتے ہیں، سب سے پہلی بار "رویو دُپاری" (Revue de Paris) میں قسط وار طبع ہوا تھا؛ بعد از آں اس پر فحاشی کا مقدمہ چلا؛ اور بریّت کے بعد کہیں جا کر یہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ میرا گمان ہے کہ نوجوان ناول نگار (اُن کا نام ظاہر کرنا سراسر زیادتی ہو گی) شاید "بدی کے پھول" (Les Fleurs du Mal) کے "پہلے، اشاعت سے روکے ہوئے ایڈیشن" کا سوچ رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں، اگر اس کی نوبت آئی، وہ غلطی کا بروقت ازالہ کر لیں گے۔

بھوری آنکھیں، نیلی آنکھیں۔ کیا اِس سے واقعی کوئی فرق پڑ جاتا ہے؟ نہیں، اگر ادیب خود

اپنی ہی تردید کرے تو اِس سے کون سا فرق پڑ جاتا ہے؛ لیکن، کیا اِس کی اہمیت ہے کہ آنکھیں کِس رنگ کی ہیں؟ جب ناول نگاروں کو عورتوں کی آنکھوں کے رنگ کا ذکر کرنا پڑ جائے تو مجھے اُن پر رحم آتا ہے؛ پسند کے لیے انتخاب اتنا محدود ہوتا ہے اور، انتہائے کار، جس رنگ پر نظر ٹھہرائیے، نہایت پیشِ پا اُفتادہ مضمرات کا حامل نکل آتا ہے۔ اُس کی آنکھیں نیلی ہیں؛ معصومیت اور ایمانداری! سیاہ ہیں؛ شہوانیت اور گہرائی! سبز ہیں؛ سرکشی اور حسد! بھوری ہیں؛ اعتبار اور عمومیت! بنفشی ہیں؛ ناول ریمنڈ چینڈلر (Raymond Chandler) کا نوشتہ ہے! خاتون کے کردار کے بارے میں جملۂ معترضہ کے کسی توشہ داں کے بغیر آپ کی اِس تمام چکّر سے گلوخلاصی بھلا کہاں ممکن ہے۔۔۔ اُس کی آنکھیں کیچڑ کے رنگ کی ہیں؛ وہ جو کانٹیکٹ لینسز استعمال کرتی ہے تو اُس کی آنکھیں اسی حساب سے اپنا رنگ بدل لیتی ہیں؛ اُس نے اُس کی آنکھوں کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں۔۔۔ ہاں تو، انتخاب کے لیے جو چاہیں چُن لیجیے۔ میری بیوی کی آنکھیں سبزی مائل نیلی تھیں، جس سے اُس کا قصّہ خاصا طول طویل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ لکھنے والا، صاف گوئی کے خالص ذاتی لمحات میں، آنکھوں کی تعریف کی مہملیت کا شاید ضرور معترف ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نسوانی کردار کا تصوّر کرتا ہے، اُسے ایک شکل میں ڈھالتا ہے، اور پھر — سب سے آخر میں — اُن ویران خانہ ہائے چشم میں کانچ کی آنکھوں کی ایک جوڑی بٹھا دیتا ہے۔ آنکھیں؟ جی ہاں، اُس کی آنکھیں تو ہونی ہی چاہئیں، وہ واماندہ تواضع سے سوچتا ہے۔

اپنی ادبی چھان بین کے دوران بووار اور پےکوشے (١) کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیب غلطی کا مرتکب ہوا نہیں کہ اُن کی نظر میں بیچارے کی ساری عزّت آبرو جاتی رہی۔ دوسری طرف مجھے اگر تعجّب ہے تو اِس بات پر کہ ادیب کس قدر کم غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لی ایژ (Liege) کا اُسقف، جب مرنا چاہیے اُس سے پندرہ سال پہلے ہی مر جاتا ہے؛ تو کیا اِس سے "کوئیں دُو روار" (Quentin Durward) باطل ہو جاتا ہے؟ یہ بڑی معمولی سی بدعنوانی ہے، جو تبصرہ نگاروں کی طرف اُچھال دی گئی ہے۔ میں ناول نگار کا تصوّر اِس طرح کرتا ہوں کہ وہ (برٹش) چینل پر آمد و رفت اور نقل و حمل کی کشتی کے دُنبالے میں جنگلے سے لگا کھڑا ہے، اور اپنے سینڈوچ سے چُنی ہڈی کے ٹکڑے توڑ توڑ کے سامنے منڈلاتے ہوئے آبی پرندوں کی طرف پھینکتا جا رہا ہے۔

میں اِتنی دور بیٹھا تھا کہ ایِنڈ سٹارکی کی آنکھوں کا رنگ دیکھنے سے قاصر تھا؛ موصوف کے بارے میں مجھے صرف اِتنا ہی یاد ہے کہ اُنھوں نے ملاحوں (٢) جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے،

---

١ ۔ یہ دونوں فلوبیر کے نامکمّل ناول (Bouvard et Pecuchet) کے کردار ہیں۔ اِس ناول میں، جو فلوبیر کی وفات کے بعد شائع ہوا، بابُو قسم کے نقادوں نے خوب کیڑے نکالے ہیں اور اِس میں سائنس سے متعلق پائی جانے والی غلطیوں پر مصنف کا بڑی جارحیت کے ساتھ مواخذہ کیا ہے۔ (مترجم)

٢ ۔ اصل میں matelot کا لفظ استعمال ہوا ہے، جسے sailor کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔ "ملاح" بس کام چلاؤ ترجمہ ہے۔ (مترجم)

چال میں سکرم ہاف (scrum-half) (۳) کا انداز تھا، اور نہایت بھیانک فرانسیسی لہجے کی مالک تھیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی فرانسیسی ادب کی ریڈر امیریٹس اور سمّرول کالج کی آنریری فیلو، جو "بودلیر، راں بو، گوتئیر، ایلیٹ، اور ژید جیسے ادیبوں کے سوانح اور فن پاروں پر اپنی مطالعاتی کتابوں کے لیے مشہور تھیں"۔ (میں یہاں اُن کی کتاب کے گردپوش کے، ظاہر ہے، پہلے ایڈیشن سے اقتباس پیش کر رہا ہوں)، اور جنھوں نے دو ضخیم کتابیں اور اپنے زندگی کے کئی سال "مادام بوواری" کے مصنّف پر وقف کر رکھے تھے --- موصوف نے پہلی جلد کے فرنٹ پیس کے واسطے "گستاو فلوبیر، ایک گمنام مصوّر کے مُوقلم سے" نامی پورٹریٹ کا انتخاب کیا۔ یہ سب سے پہلی چیز ہے جس سے ہماری نظریں چار ہوتی ہیں۔ یہ، آپ چاہیں تو، وہ لمحہ ہے جب ڈاکٹر سٹارکی ہمیں فلوبیر سے متعارف کراتی ہیں۔ لیکن بس مصیبت ساری یہ ہے کہ یہ فلوبیر کی نہیں، لوئی بوئیے (Louis Bouilhet) کی پورٹریٹ ہے، جیسا کہ کرواسے (Croisset) (۴) کی کوئی بھی پاسباں عورت (gardienne) آپ کو بہ آسانی بتا دے گی۔ بغلیں بجانا ختم ہوتے ہی یہ حقیقت منھ تک رہی ہوتی ہے۔ اس کا کیا کیا جائے؟

شاید آپ ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں کہ میں ایک آنجہانی عالمہ کے خلاف مقاومت کا مظاہرہ کر رہا ہوں، اور وہ بھی جو اپنی مدافعت سے معذور ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مگر رکھوالوں کی رکھوالی کون کرتا ہے؟ (Quis custodiet ipsos custodes?) ایک اور بات آپ کو بتاتا چلوں، میں نے ابھی ابھی "مادام بوواری" دوبارہ پڑھی ہے۔

> ایک موقعے پر وہ ایما کی آنکھوں کا رنگ بھورا دکھاتا ہے (۱۴)، ایک اور موقعے پر گہرا سیاہ (۱۵)؛ اور ایک اور موقعے پر نیلا (۱۶)۔

اور اِس تمام بھاگ دوڑ سے جو سبق نکلتا ہے وہ، میرے خیال میں، یہ ہے؛ فٹ نوٹس کا دیدار ہوتے ہی دُم دبا کر بھاگ نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ یہ رہے وہ چھ حوالے جو فلوبیر نے پوری کتاب میں ایما بوواری کی آنکھوں کے بارے میں دیے ہیں؛

> ۱ - (جب ایما پہلی بار ظاہر ہوتی ہے) "جہاں تک اُس کے حسین ہونے کا تعلق ہے، تو اِس حسن کا مرجع اُس کی آنکھیں تھیں؛ اگرچہ یہ بھوری تھیں، تاہم اُس کی پلکوں کے باعث سیاہ نظر آتی تھیں..."

---

۳ - رگبی کھیل میں وہ کھلاڑی جو پالے یا فیلڈ کے وسطی خط کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہ بازو ایک دوسرے میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ اپنی گری گری سی ہیئت کذائی میں لجاجت سے پاؤں پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔
(مترجم)

۴ - دریائے سین پر رُواں کے نواح میں فلوبیر کی املاک کا نام، جہاں وہ ۱۸۴۶ میں اپنے والد کی وفات کے بعد مستقل قیام کے لیے اُٹھ آیا تھا۔
(مترجم)

> ۲ - (شادی کے اوّلیں ایام میں، اپنے پرستار شوہر کی زبانی) "اُسے اُس کی آنکھیں بڑی لگتیں، خاص طور پر اُس وقت جب وہ بس ابھی بیدار ہو رہی ہو اور جلدی جلدی اپنے پپوٹے پھڑپھڑا رہی ہو؛ سائے میں سیاہ اور کھلی روشنی میں یہ گہری نیلی نظر آتیں؛ اور ایسا لگتا جیسے اِن میں رنگوں کی تلے اُوپر تہیں کی تہیں جمی ہوں، جو نیچے گہرائیوں میں گہرے رنگ کی ہوں اور میناکاری جیسی سطح تک آتے آتے ہلکی پڑ رہی ہوں۔"
>
> ۳ - (لیاوں سے پہلی ملاقات ہونے پر) "وہ اُسے بڑی بڑی پوری کھلی ہوئی آنکھوں سے تکنے لگی۔"
>
> ۴ - (موم بتّیوں کی روشنی میں ایک رقص کے دوران) "اُس کی سیاہ آنکھیں کچھ اور زیادہ سیاہ نظر آ رہی تھیں۔"
>
> ۵ - (درونِ خانہ، جیسی کہ وہ رودلف کو اُس وقت نظر آتی ہے جب وہ پہلی بار اُس کا معائنہ کر رہا ہوتا ہے) "اُس کی سیاہ آنکھیں..."
>
> ۶ - (درونِ خانہ، شام کے وقت، جب ایما ابھی ابھی رودلف کی جنسی ترغیب میں آنے کے بعد آئینہ دیکھ رہی ہے) "اُس کی آنکھیں اِس سے قبل اتنی بڑی نہیں تھیں، نہ اتنی سیاہ، نہ اِن میں اتنی زیادہ گہرائی تھی۔"

ہاں تو نقّاد نے کیا کہا تھا؟ "فلوبیر اپنے کرداروں کی تعمیر اِس طرح نہیں کرتا جس طرح بالزاک کرتا تھا، معروضی اور خارجی بیان کے ذریعے؛ سچ تو یہ ہے کہ وہ اُن کے ظاہری حلیے کے معاملے میں اِس قدر لاپروا واقع ہوا ہے کہ---" فلوبیر نے جو وقت اِس بات کا یقین کر لینے پر صرف کیا ہو گا کہ اُس کی ہیروئن کی آنکھیں واقعی ایک دردناک زانیہ کی مشکل پسند آنکھوں ہی کی طرح نظر آئیں، اُس کا مقابلہ اُس وقت سے کیا جائے جو ڈاکٹر سٹارکی نے فلوبیر کو اِس قدر مندے داموں فروخت کرنے پر لگایا ہے، تو یہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

اور ہاں، ایک آخری بات اور سہی، پورا اطمینان کر لینے کے لیے۔ فلوبیر کے بارے میں ہماری قدیم ترین مستحکم معلومات کا ماخذ مکسیم دُشاں (Maxime du Champs) کی کتاب "سوونیر لیتیریر" (Souvenirs litteraires) (مطبوعہ پیرس، ہاشیت ۱۸۸۲-۳) کی دو جلدیں ہیں، جو غپ شپ سے پُر، خودنما و خودبیں، اپنی صفائی آپ پیش کرنے والی اور ناقابلِ اعتماد ہونے کے باوجود، تاریخی طور پر ناگزیر ہیں۔ پہلی جلد (جو ریمنگٹن اینڈ کمپنی نے لندن سے ۱۸۹۳ میں شائع کی، اور جس پر مترجم کا نام نہیں دیا گیا) کے صفحہ ۳۰۶ پر دُشاں اُس عورت کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے جس پر ایما کے کردار کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہ عورت، دُشاں کے بیان کے مطابق، رُواں (Rouen) کے نواح میں بوں لکور (Bon-Lecours) کے ایک میڈیکل آفیسر کی دوسری بیوی تھی؛

> یہ دوسری بیوی خوب صورت نہیں تھی؛ کوتاہ قد اور پھیکے سے زرد بالوں والی تھی، اور اِس کا چہرہ چھائیوں سے اَٹا پڑا تھا۔ یہ ڈینگیں مارنے کی عادی تھی؛ اپنے شوہر کو

Scanned with CamScanner

حقیر گردانتی تھی کیونکہ وہ اُس کے خیال میں بےوقوف تھا۔ یہ ایک گول مٹول اور کھلتے رنگ کی عورت تھی، اُس کی چھوٹی چھوٹی بڈیوں پر خوب گوشت چڑھا ہوا تھا، اور اُس کی چال نیز عام وضع قطع میں اُسی لچک اور لہردار حرکت کا احساس ہوتا تھا جو بام مچھلی کا خاصّہ ہے۔ اُس کی آواز، اُس کے زیریں نارمندی کے مخصوص لہجے کے عامیانہ پن کی وجہ سے، ملاحت اور ملاطفت سے چھلکی پڑتی تھی، اور اُس کی آنکھوں میں، جن کے رنگ کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل ہے -- سبز، سرمئی، یا نیلی، اِس کا انحصار روشنی کے انعکاس پر تھا -- ہمیشہ ہی ایک منت سماجت کا تاثر ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر سٹارکی اِس وضاحتی پارے کے وجود سے بڑے پُرسکون طور پر نابلد معلوم ہوتی ہیں۔ القصّہ، یہ ایک طرح کا تحکّمانہ اِغماض ہے، اور وہ بھی ایک ایسے ادیب کے حق میں جس نے، بہ اپنی طور و بہ اُن طور، اُن کے بہت سے گیس کے بِل ادا کیے ہوں گے۔ سچ پوچھیں تو بس اِس قسم کی باتیں مجھے سخت چراغ پا کر دیتی ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا نا کہ مجھے نقّادوں سے کیوں نفرت ہے؟ میں اُس تاثر کو بیان کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں جو اِس لمحے میری آنکھوں میں ثبت رہا ہے؛ لیکن وہ مارے طیش کے کچھ زیادہ ہی بدرنگ ہو چلی ہیں۔

(ناول "فلوبیر کاتوتا" کا چھٹا باب)

انگریزی سے ترجمہ: محمّد عمر میمن

انتساب:
مظہر علی خیّد کے نام
(مترجم)

جولیَن بارنز
(Julien Barnes)

۱۹۴۶ میں لائسسٹر، انگلستان میں پیدا ہوئے، اور لندن اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ انگریزی کے جدید ناول نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ *Flaubert's Parrot* ، جس کے ایک باب کا ترجمہ اس شمارے میں شامل ہے، اُن کا تیسرا ناول تھا۔ پچھلے برس اُن کا ایک اور ناول *History of the World in 10-1/2 Chapters* شائع ہوا۔

فاروق خالد

اپنی دعاؤں کے اسیر - ۲

وہاں کی زمیں اپنے درختوں کے سائے سونکھتی تھی۔ پرندے اس مہک بھری فضا میں ڈالیوں پر پھڑپھڑاتے اور پتوں کی جھالروں میں اترتے نکلتے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے۔ ماحول میں ایک ایسے حسی کی تازگی تھی جو اردگرد کی ہر شے کے لیے حیات افروز تھی۔ بشیر اپنی گونگی بہری بیوی کلثوم، اس کی بغیر بازو والی بہن سیما، اور اندھی بہن ساجھی کے ساتھ چند دنوں کے لیے وہاں گیا تھا۔ وہ اپنے ڈاک بنگلے سے کچھ دور سیر کرتے ہوئے ایک طرف کو جا رہے تھے۔ وہ قدرے ڈھلوان جگہ تھی جہاں بےترتیب اگی جھاڑیاں اور گھاس پھوس آپس میں رل مل گئی تھیں۔ اس گھاٹی سے اترنے کے بعد وہ ایک ہموار قطعہ ارض پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ سیما نے ساجھی کا ایک ہاتھ اپنے زانو پر رکھا اور اپنے اکیلے ہاتھ سے اسے سہلانے لگی۔ ساجھی ایک ہی سمت میں اپنی آنکھیں کھلی رکھے مسکرا دیتی تھی۔ بشیر نے انھیں آپس میں مگن رہنے دیا اور کلثوم کو لے کر ان سے دور چلا گیا۔ سیما اور ساجھی ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔ اچانک سیما کو ایک گلہری دکھائی دی جو ایک اونچے درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ وہ اسے پکڑنے کو دوڑی تو گلہری کچھ فاصلے پر ایک پودے کی اوٹ میں چلی گئی۔ اس نے اسے دوبارہ پکڑنا چاہا، مگر وہ آگے جا کر اسے دیکھنے لگی۔ ایسا پھر ہوا، اور یوں سیما ساجھی سے دور ہوتی چلی گئی۔ ساجھی نے اسے آواز دی، اور تب وہ اندازے سے اس طرف چل دی جس طرف سیما گئی تھی۔ اس کی بےچینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر سیما، کلثوم، بشیر اور خدا کو آوازیں دیں اور بھاگتی ہوئی درختوں سے ٹکرانے لگی، اور بالآخر ایک جگہ پودوں میں الجھ کر گر پڑی۔

ساجھی کو ہوش آیا تو اس کے اردگرد ہمیشہ کا اندھیرا تھا۔ اس نے بڑبڑا کر "باجی! باجی!" پکارا اور بستر سے اٹھنا چاہا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے گر گئی۔ اسے بجلی کا قمقمہ روشن ہونے یا بجھنے کی کلک سنائی دی۔ کوئی آہستگی سے چل رہا تھا۔

rekhta
Scanned with CamScanner

"ڈرو نہیں۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔" کسی مرد نے پیار سے کہا۔

ساجھی نے جانا کہ کمرے میں، جہاں کہیں بھی وہ ہے، ریڈیو رکھا ہے جو کسی صوتی انگیٹھی کی مانند دھیرے دھیرے سلگ رہا ہے، ریڈیو کی سوئی کسی اسٹیشن پر ٹھیک سے نہیں تھی، یا وہاں سے نشریات ختم ہو چکی تھیں۔ تب کچھ فاصلے سے کوئی بچہ بلبلا کر رونے لگا۔ اسی شخص کی آواز سنائی دی، "تم اسے باہر لے جاؤ اور اس کے لیے دودھ گرم کرو۔"

"ٹھیک ہے، ظفر صاحب۔" کسی عورت نے کہا، "جب آپ کو میری ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔"

ظفر احمد اپنے دوست امتیاز علی اور اس کے نوعمر بچے کے ساتھ ہالینڈ کے شہر امستردم میں رہتا تھا۔ پہلے ان کے پاس علیحدہ علیحدہ گھر تھے، مگر کچھ عرصے قبل امتیاز کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا تو انھوں نے ایک مکان کی اوپر اور اس سے نیچے کی منزل میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک مدت بعد پاکستان آئے تھے۔ امتیاز دوبارہ شادی کرنے کی غرض سے، اور ظفر اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے، جبکہ درپردہ اسے انگلستان میں مقیم اپنے ساتھی افتخار حمید کے لیے چند کام کرنے تھے۔ اس سلسلے میں وہ صوبہ سرحد میں ایک اہم معاملہ طے کرنے کے لیے روانہ ہونے لگا تھا تو امتیاز کے پوچھنے پر اس نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ سیر و تفریح کرنے جا رہا ہے۔ امتیاز نے، جس کی کچھ روز قبل دوسری شادی ہوئی تھی، کہا تھا کہ وہ بھی اپنی بیوی اور بچے کو گھمانے پھرانے اس طرف لے جاتا ہے۔ وہ وہاں پہنچے تھے۔ ظفر نے اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا تھا۔ ان کا ارادہ دوسرے روز واپس اپنے آبائی شہر جانے کا تھا کہ امتیاز کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ اسے لے کر ایک قریبی ہسپتال گئے تھے، جہاں اسے کم از کم ایک روز کے لیے داخل کر لیا گیا تھا۔ امتیاز کی نوبیاہتا بیوی روشی اور ظفر بچے کو لیے اپنی قیام گاہ کو آ رہے تھے کہ انھیں ایک جگہ ساجھی بےہوش پڑی ملی تھی۔

"میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں؟" ساجھی نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم حفاظت میں ہو۔" ظفر نے جواب دیا۔ "ہم نے تمھیں ویرانے میں پڑا پایا تو اپنے ساتھ لے آئے۔ تم کون ہو، اور کہاں کی رہنے والی ہو؟"

ساجھی نے اپنا نام، اپنے شہر، گلی اور اسکول کا نام پتا بتا دیا، اور کہا کہ وہ اس علاقے میں اپنی بہنوں اور بہنوئی کے ساتھ آئی تھی اور ان کے پاس جانا چاہتی ہے۔

"فکر نہ کرو، ہم تمھاری مدد کریں گے۔ میں، میرا دوست اور اس کی بیوی اور بچہ یہاں چند روز کے لیے ٹھہرے ہیں۔ یہ بتاؤ، کیا تم بالکل نہیں دیکھ سکتیں؟"

"ہاں، میں اندھی ہوں اور اس دنیا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔" اسے اپنے قریب روتے ہوئے بچے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی، اور اسے یوں لگا کہ وہ ٹھوکر کھا کر گرا ہے۔ اسے اس کے سسکیاں لینے میں ہلکے ہلکے جھٹکوں سے معلوم ہوا کہ آدمی نے اسے اپنے بازو میں اٹھا لیا ہے اور اس کی کمر تھپکتا ہوا ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ دفعتاً ساجھی کو دودھ جلنے کی بُو آئی اور اس کے ساتھ ان دونوں کے دور جانے اور دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

ظفر بچے کو لیے باورچی خانے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ آگ پر برتن میں رکھا دودھ ابل کر باہر بہہ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے برتن نیچے اتارا اور دودھ کو کچھ ٹھنڈا کر کے بوتل میں ڈالا۔ بوتل منھ سے لگتے ہی بچہ پُرسکون ہو گیا۔ ظفر روشی سے ملنے گیا تاکہ وہ بچے کو سنبھالے اور یہ واپس ساجھی کے پاس جائے۔ روشی سونے کے کمرے میں تھی جس کا دروازہ پوری طرح سے بند نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی قمیض اپنے شانوں تک اٹھائے کھڑی ہے اور ناخنوں سے اپنی چھاتیاں کھرچتی ہوئی اور اپنے سر کو ہلکے ہلکے انداز میں پیچھے کو جھٹکتی ہوئی لذّت آمیز درد سے کراہ رہی ہے۔ اس کے پستان، جو سیاہی مائل چوچیوں کے گرد گہری رنگت کے گول دھبے لیے ہوئے تھے، کہیں کہیں سے زخمی تھے۔ تب اس نے قمیض نیچے کی، اور کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بازو دائیں بائیں فرش کی سمت لٹکے ہوئے تھے اور وہ بلاحرکت پڑی تھی۔ ظفر نے سوچا شاید سو گئی ہے۔ وہ کچھ دیر اسے یونہی دیکھتا رہا، اور پھر بچے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ آہٹ پاتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ظفر اسے بچے کا خیال رکھنے کو کہنے والا تھا کہ وہ الٹے اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی جلد ہوئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گتّے کا ایک بڑا ڈبّا اٹھا رکھا تھا اور جھکی ہوئی بمشکل چل رہی تھی۔ اس نے اسے فرش پر رکھا اور گہری سانس لے کر اس پر بیٹھ گئی۔

"پچھلے دو روز سے میں اسے سیڑھیوں کے قریب والی الماری میں دیکھ رہی ہوں۔" روشی نے کہا۔ "میں نے ابھی ابھی سوچا کہ معلوم کرنا چاہیے اس میں کیا ہے؟"

"یہ تمھارا نہیں ہے۔ تمھیں اسے کھولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اسے تو میں ضرور کھولوں گی، مگر سیڑھیوں کے نیچے کوٹھری میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہاں ایک پنگوڑا پڑا ہے اور میرا خیال ہے اس میں کوئی سو رہا ہے۔ کیا وہ امتیاز کا دوسرا بچہ ہے؟ یا کوئی اسے اندھی لڑکی کے لیے چھوڑ گیا ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔" ظفر یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔

"وہ اندھی لڑکی کون ہے؟" روشی نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ ظفر نے جواب نہ دیا۔ وہ اس کے ساتھ کوٹھری کے سامنے پہنچا جس کا دروازہ بھی چھوٹا تھا۔ اس نے اسے کھولا تو اسے دیوار کے ساتھ کیل سے لٹکی لالٹین کی مدھم روشنی میں لکڑیوں کا ڈھیر دکھائی دیا، جو آتشدان کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور اس کے قریب پنگوڑے میں کوئی کمبل تلے لیٹا ہوا تھا۔ دفعتاً کمبل میں جنبش ہوئی اور قدرے سفید مگر زیادہ تر سیاہ داڑھی کا ایک ہونا انھیں اپنے سامنے بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی، مگر قد ڈھائی فٹ سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اس نے کئی دنوں کی ایک گندی بنیان پہنی ہوئی تھی اور اپنی ٹانگوں کے گرد ہلکے اور گہرے نیلے رنگ کی ایک خانےدار دسمالی لپیٹ رکھی تھی۔ وہ پنگوڑے سے باہر کودا اور ان

Scanned with CamScanner

کے پاس آتے ہوئے بولا۔"جناب، میرا نام عبدالرّحمٰن ہے اور میں اس عمارت کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، مگر میں کچھ دیر پہلے سفر سے تھکا ہارا لوٹا تھا، اور رات بھی ہو رہی تھی، اس لیے میں نے سوچا صبح ہی آپ سے ملاقات ہو گی۔"

جس آدمی نے ہمیں یہ جگہ دی ہے اس نے ہمیں تمہارے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔" ظفر نے کہا۔

"وہ اکثر یہ غلطی کر جاتا ہے۔ میری بہن اس سے بیاہی ہوئی ہے۔ میں اسی کے ایک کام سے دوسرے گاؤں گیا تھا۔ سارے دن پیدل چلنے سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ میرے لائق خدمت ہو تو بتائیں؟"

"نہیں، شکریہ، عبدالرّحمٰن۔ تم سوؤ۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہیں بےآرام کیا۔"

"جناب، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب تو میں اٹھ ہی گیا ہوں۔ آپ کہیں تو آپ کے لیے چائے بناؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہمیں طلب ہوئی تو ہم خود بنا لیں گے۔ تم بےفکر ہو کر سو جاؤ۔"

ظفر روشی کے ساتھ واپس ہوا۔ اس نے اس سے پوچھا، "تم ڈبّا کیوں اٹھا لائی تھیں؟ ممکن ہے وہ اسی ہونے کا ہو؟"

"جب وہ یہاں نہیں تھا تب بھی ڈبّا اس جگہ موجود تھا۔"

"یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ میں اندھی لڑکی کے پاس جاتا ہوں، بےچاری پریشان ہو رہی ہو گی۔"

ظفر ساجھی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ دیوار کو چھوتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی؛ بلاشبہ وہ دروازے کی تلاش میں تھی۔

"ساجھی،" ظفر نے اسے آواز دی۔ "کیا آج کی رات تم یہاں بسر کر سکتی ہو؟ باہر بہت اندھیرا ہے۔ صبح ہم تمہارے بہن بھائیوں کو تلاش کریں گے۔"

"میرے لیے کیا اندھیرا اور کیا سویرا؟ کون جانے دن کیسا ہوتا ہے اور رات کیسی؟" وہ دیوار سے چپک کر رک گئی، اور آنکھیں جھپکتی ہوئی اور بھی افسردہ، خوف زدہ دکھائی دینے لگی۔

ظفر کوئی بات کرتا، یا لمحات کو یونہی گزرنے دیتا، اس سے پہلے روشی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں سائیکل کے پہیوں میں ہوا بھرنے والے دو پمپ تھے۔ اس نے ظفر سے کہا،"میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ ڈبّے میں ان کے علاوہ آلاتِ جرّاحی، ٹام چینی کے برتن، اخروٹ، بادام، پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند گھنگریالے بال اور سنیما کے غیر استعمال شدہ ٹکٹوں کے بنڈل ہیں۔ یہ کیسی جگہ ہے؟ وہ ہوتا کون ہے؟ اور یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"تمہیں اس کے متعلق فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔" ظفر نے جواب دیا۔ "پمپ اور باقی اشیا تمہاری اپنی دریافت ہیں۔ تمہیں الماری اور ڈبّا کھولنے کو کس نے کہا تھا؟"

الماری کھلنے میں دیر نہیں لگی تھی، مگر موت پلک جھپکنے سے پہلے وہاں پہنچ گئی اور بوڑھے آدمی کے جسم کو ساکت کر کے واپس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے نرس کو ڈبے میں سے دوا نکالنے سے منع کیا اور اس کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ عورت بھاگ کر اندر داخل ہوئی اور مختلف اوقات کے حامل شوہر کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر بولی،"اس وقت تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے الماری کے پٹ کھولنے چاہے تھے کہ مرد نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اردگرد سے بےنیاز ہو کر اسے بستر پر لے جانے کی کوشش کی۔ "چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔" عورت چلائی اور اس نے اس کی گرفت سے نکل جانا چاہا۔ "میری بات تو سنو،" مرد بولا۔ "یوں خواہ مخواہ غصہ مت کرو۔ تمہارے بھائی نے مجھ سے کیوں کہا تھا کہ سائیکل کی سواری میرے لیے محض جسمانی حسن و طاقت کی نمائش ہے، اور یہ کہ میرے بالوں کے گھنگر اصلی نہیں بلکہ مختلف ادویات کھانے سے بنے ہیں۔ اسے اس سے کیا مطلب کہ میں کہاں جاتا ہوں، کن لوگوں سے ملتا ہوں اور اپنے پیشہ وراند فرائض کی طرف توجہ دینے کی بجائے خشک میووں کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔" اپنی زندگی میں انواع و اقسام کے کام دھندے کرنے والا سنیما مینجر اس سے علیحدہ ہوا اور اپنی بےشمار سوچوں سے تنگ آ کر اس نے اپنی انگلیوں میں تھامے سلگتے ہوئے سگریٹ کو چائے سے آدھی بھری پیالی میں جھونک دیا، اورکھڑکی کھولنے پر اسے یاد آیا کہ دراصل وہ اس کی شلوار کھولنا چاہتا تھا۔

روشی اپنے پہلے شوہر کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو اس کے پستانوں پر پان چبائے دانتوں کی مہریں لگایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسی وجہ سے اسے یہاں کھجلی شروع ہوئی تھی۔ مگر وہ بھول چکی تھی کہ بچپن میں غسل خانے کا دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے نہانے سے پہلے وہ اپنی ہموار چھاتی پر لکڑی کے کوئلے سے بڑے بڑے دھبے نقش کرتی تھی، جی سے نہ جلتا اور نہ بجھتا دودھ برآمد ہوتا تھا اور اس کے پیٹ پر، جو بےحد ملائم تھا، کوئلے ہی سے بنایا گیا بچّہ پانی کے بہاؤ سے پھسل جاتا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد جب رات کے اندھیرے میں اس کے شوہر نے کھڑکی کے پٹ کھول کر پان کی پیک باہر پھینکی تھی تو اس کے پستان پر انجانی خارش اترنے کو تیار ہو گئی تھی۔ تب اس کمرے میں بھی رات کا شو شروع ہوا تھا۔ وہ فلم، جس کے دو تماشائی خود اس کے اداکار تھے، صرف بالغوں کے لیے تھی، کیونکہ بچے وہاں کبھی بھول کر بھی نہیں آئے تھے --- وہ راستا نہ تو کھیل کے میدان میں نکلتا تھا اور نہ ہی کسی اسکول کی چاردیواری میں۔ وہ سائیکل کے پمپ کمرے میں چھوڑ کر واپس جانا چاہتی تھی کہ ظفر نے اس کا نام لے کر اسے روک دیا اور بولا، "ممکن ہے یہ پمپ اور دوسرا سامان عبدالرّحمٰن کے بہنوئی کا ہو۔ تم انہیں ڈبے میں بند کر کے اسے وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائی تھیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام میں خود کروں گا۔" عبدالرّحمٰن کی اچانک رونمائی سے وہ چونک پڑے۔ وہ روشی کے پیچھے اپنے ہاتھ بغلوں میں دابے اور سر کندھوں میں سکیڑے کھڑا تھا۔ اس وقت وہ بنیان اور دسمالی پہنے ہوئے نہیں تھا، بلکہ ایک گہرے نیلے رنگ کا کوٹ، جو کسی طالب علم کے یونیفارم کا حصہ تھا، اور جس کے کالر کے پاس والی جیب پر مدرسے کا

Scanned with CamScanner

امتیازی نشان تھا، اس کے جسم پر ڈھیلے ڈھالے اوورکوٹ کا کام دے رہا تھا۔ اس کے پاؤں جوتوں سے بےنیاز تھے، اور کوٹ کے نیچے ٹانگوں کے باقی حصے پر بھی لباس نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ اس کی داڑھی کے بالوں میں پیتل جیسی دھات کی دو مُندریاں بندھی تھیں۔ اس کا حلیہ یقیناً مسخروں جیسا تھا، مگر اس وقت وہ بلا کا سنجیدہ تھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھا اور بولا، "میرا بہنوئی، کریم، صبح یہاں آئے گا۔ ڈبا اس کے ایک دوست کا ہے۔ میں اسے اٹھا کر واپس لے جاتا ہوں۔"

اس نے سائیکل کے دونوں پمپ روشنی سے لیے اور انھیں بندوقوں کی طرح اپنی بغلوں تلے داب کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ روشنی بھی وہاں سے چل دی۔ ساجھی بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹ چکی تھی۔ ظفر نے روشنی گل کی اور دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔ وہ اپنے کمرے سے ذرا فاصلے پر تھا کہ اسے سیڑھیوں کی طرف سے عجیب سی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس کے قدم خودبخود ہونے کی جانب اٹھ گئے۔ اندر سے جیسے پنکوڑے کے جھولنے کی بہت ہی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ ظفر نے سوچا کہ ممکن ہے یہ ہونے کے سانس لینے کی آواز ہو۔ اس نے اپنا کان دروازے سے لگا دیا۔ جونہی اس نے ایسا کیا یک لخت خاموشی چھا گئی، گویا اس کے اس عمل اور آواز کے رکنے میں کوئی میکانکی ربط پایا جاتا ہو۔ وہ واپس جانے کو تھا کہ ہونا دو تین مرتبہ کھانسا اور اس نے کسی کو ڈانٹ کر پرے ہونے کو کہا۔ ظفر دم بخود رہ گیا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں دستک دی اور بولا،

"عبدالرّحمٰن، کیا تم سو گئے ہو؟"

"نہیں جناب، میں جاگ رہا ہوں"۔ ہونا دھم سے فرش پر کودا اور دروازہ کھول کر اس کے سامنے آ موجود ہوا۔ وہ وہی نیلا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی داڑھی پر اب بھی مُندریاں بندھی ہوئی تھیں۔ کوٹھری میں کوئی اور فرد موجود نہیں تھا۔

"عبدالرّحمٰن، میں نے تمھیں تکلیف دی،" ظفر نے کہا۔

"کیسی تکلیف، جناب؟" وہ نیم تاریک ماحول میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

"تم سفر سے تھکے ماندے لوٹے ہو۔ میرا خیال ہے میں نے تمھیں یقیناً بےآرام کیا ہے۔"

"بالکل نہیں، جناب،" عبدالرّحمٰن اپنا سر منفی انداز میں ہلاتے ہوئے بولا۔ "نامانوس جگہ کی وجہ سے شاید آپ کو نیند نہ آ رہی ہو۔ یہ شکایت اکثر لوگوں کو۔۔۔"

"یہ وجہ نہیں ہے،" ظفر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمھاری کوٹھری سے ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دی تھی۔ اور تم باتیں کس سے کر رہے تھے؟"

"اوہ جناب، آپ اسے نہیں جانتے۔" اس نے پنکوڑے کے پیچھے سے ایک سیاہ بلّی کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور بولا، "کبھی کبھی یہ بڑے نخرے کرتی ہے، مگر ہے بہت اچھی۔ یقیں کریں یہ مجھے اپنی بہن کی طرح عزیز ہے۔" اس کے چھوٹے وجود کے ساتھ بلی اپنی اصلی جسامت سے بڑی دکھائی دی۔

"کیا یہ تمھارے ساتھ رہتی ہے؟" ظفر نے اس سے پوچھا۔

"جناب، یہ جنگلی بلّی تھی، مگر میں نے اسے سدھا لیا ہے۔ اب تو یہ میرے بہت کام آتی ہے۔ اس جگہ چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی۔ جب سے یہ آئی ہے ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ حضور، آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اگر آپ پسند فرمائیں تو اندر آ جائیں۔ میں آپ کے بیٹھنے کے لیے ابھی جگہ بناتا ہوں۔"

عبدالرّحمٰن نے بلی کو فرش پر چھوڑا اور کوٹھری میں ایک طرف رکھے اسٹول پر سے آئینہ اور چھوٹی موٹی اشیا اٹھانے لگا۔ ظفر انکار کرتا رہا، مگر وہ سب آناً فاناً ترتیب دے کر خود پنکوڑے میں گھس گیا۔

"تم اس میں سوتے ہو؟" ظفر نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے پنکوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں خود کو یہاں بہت آرام سے پاتا ہوں۔ میں چھوٹا تھا تو میرا باپ اسے میرے لیے لایا تھا۔ میں چلنے پھرنے لگا تو بھی مجھے چارپائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اور نہ کبھی بعد میں؛ اور اسے بھی میں نے اپنا ہمدم اور ساتھی جانا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا جسم اور یہ زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ عرصہ ہوا میرے ماں باپ فوت ہو گئے، مگر ان کی نشانی اب بھی میرے استعمال میں ہے، اور اس سے تو میری بہت یادیں وابستہ ہیں۔ چند برس قبل میرا پاؤں پھسلنے سے مجھے موچ آ گئی تھی۔ مجھے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی کہ بیان سے باہر ہے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں کہ اس پر لیٹنے سے مجھے جتنا آرام ملا اتنا دوائیوں اور خوراک سے نہیں۔ اور وہاں۔۔۔"

"میں کہنا چاہوں گا کہ پنکوڑے میں تمھارا وجود عجیب سا لگتا ہے۔ تمھارے چھوٹے رہنے کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ تم ہمیشہ اسی میں رہتے آئے ہو؟ ایسے ہی جیسے ایک خاص قسم کا محلِ وقوع لوگوں پر اثر کرتا ہے۔"

"جناب، آپ میرا مذاق نہ اڑائیں"، عبدالرّحمٰن نے درخواست آمیز لہجے میں کہا۔ "میں چھوٹا ضرور ہوں، مگر بڑا باہمّت ہوں۔"

"میرا مقصد تمھاری دل آزاری نہیں تھا۔ میں نے ایک توجیہ پیش کی تھی۔ بہت ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ پھر قد کاٹھ کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ اصل چیز تو ہمت ہے۔"

"میں آپ کو اپنی ہمت کا ایک واقعہ سناتا ہوں،" وہ جم کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں کتنا جرأت مند اور کارآمد شخص ہوں۔ پچھلی سردیوں کا ذکر ہے کہ۔۔۔"

"عبدالرّحمٰن، مجھے تمھاری صلاحیتوں پر شک نہیں ہے۔ میں نے ایک بات کی تھی جس کا تم نے غلط مطلب لے لیا۔ بہرحال، میں جاننا چاہوں گا کہ تمھارے چہرے پر یہ مُندریاں سی کیا ہیں؟ دیکھو، تم میری اس بات سے بھی ناراض نہ ہو جانا۔"

"جناب، یہ میرا شوق ہے۔"

"میں یورپ میں رہتا ہوں۔ وہاں میں نے مردوں کو اپنے کانوں اور انگلیوں میں چھلّے اور مُندریاں پہنے دیکھا ہے، مگر داڑھی میں بندھی مندریاں؟"

"چھلّوں یا مُندریوں کی کانوں اور انگلیوں میں بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے؛ اور اگر

Scanned with CamScanner

یہ کانوں اور انگلیوں میں پہنی جا سکتی ہیں تو پھر داڑھی پر کیوں نہیں؟ یہاں تو یہ تکلیف بھی نہیں دیتیں، محسوس تک نہیں ہوتیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں، تمہاری عمر کیا ہے؟"

"میں سینتالیس برس کا ہوں۔ میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب ہٹلر کا زمانہ تھا۔ میں اس عمارت کی دیکھ بھال کے علاوہ کبھی کبھی اردگرد کے لوگوں کے کام کے لیے گردو نواح کے علاقوں میں چلا جاتا ہوں۔ کریم نے مجھے ایک آدمی سے چند سو روپے لانے بھیجا تھا۔ وہ خود تو اپنے شہر گیا ہوا تھا، مگر اس کے چھوٹے بھائی نے مجھے گالیاں دے کر اور بےعزت کر کے بھگا دیا۔"

ہونا ہڑا باتونی تھا۔ اگر اس سے ایک سوال پوچھا جاتا تو وہ اس کے جواب کے آخر میں دس نہ پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی ٹانک دیتا تھا، اور اکثر اوقات اس وقت تک بولتا رہتا جب تک مخاطب کوئی بات کہہ کر اس کی گفتگو میں وقفہ نہ ڈالتا۔ ظفر خاموش تھا کہ وہ پھر بولا:

"جناب، کچھ عرصہ ہوا وہ آدمی اپنے بھائی اور چند دوستوں کے ساتھ یہاں آیا۔ ان کے ساتھ خوب دھڑلے کی عورتیں تھیں جو ہر وقت سرخی پاؤڈر لگائے بنی ٹھنی رہتیں۔ وہ لوگ شراب پی کر رات گئے تک غل غپاڑا مچاتے اور قہقہے لگاتے۔ انھوں نے واقعی جنگل میں منگل منایا۔ وہ جانے لگے تو ان کی طرف ہماری کچھ رقم نکلتی تھی۔ ہمارے پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ ہم کل صبح کسی کو ان کے ہاں بھیج کر ان سے منگوا لیں۔ میں پہلے بھی اس آدمی کے گھر کئی چکر لگا چکا ہوں، اور آج اس کے بھائی نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔ میں سوچتا ہوں اب مجھے شہر جا کر اس کے ..."

"کیوں کیا ہوا؟" پیشتر اس کے کہ عبدالرّحمٰن کسی اور واقعے کے بیان میں بہہ نکلے، ظفر نے اس سے پوچھا۔

"اس کے جس بھائی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بڑا ہتھ چھٹ ہے۔ اسے لوگوں نے روکا ورنہ وہ تو لاٹھی لے کر مجھے زدوکوب کرنے دوڑا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ آئندہ اگر اس نے میری شکل دیکھی تو وہ میری آنکھیں نکال لے گا۔ اب آپ بتائیں کہ ایسے لوگوں کی ہم کس سے شکایت کریں؟ پولیس ان کی ہے، تھانا ان کا ہے، اور تو اور ہم جسے اس عمارت کا ماہانہ کرایہ ادا کرتے ہیں، وہ ان کا ایک قریبی رشتےدار ہے جو ان کے خلاف کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں جھوٹ بول کر لوگوں کو بدنام کر رہا ہوں۔ آپ مجھ سے جیسی چاہیں قسم لے لیں کہ جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ آپ مجھے ہمدرد اور مہربان شخص دکھائی دیتے ہیں، اس لیے میں نے آپ کو اپنے مصائب سے آگاہ کیا ہے۔ حضور، یہ بتائیں وہ اندھی لڑکی کون ہے جو یہاں ٹھہری ہوئی ہے؟ میں یہاں کئی بار اندھے لوگ دیکھ چکا ہوں۔ چند ماہ پہلے مسجد کے پاس بھی دو اندھے رہا کرتے تھے، جو اس وجہ سے بہت مشہور تھے کہ وہ ایک دوسرے کے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال استرے سے مونڈا کرتے تھے، اور انھیں کبھی خراش تک نہ آئی تھی۔ پھر اچانک وہ کہیں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد..."

"عبدالرحمٰن، میں اب جاتا ہوں۔" ظفر اس کی پوری بات سنے بغیر یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور کوٹھری سے باہر آیا۔ اس کا رخ ساجھی کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ سو گئی ہے یا نہیں۔ اس نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر نہایت احتیاط سے روشنی کا سوئچ آن کیا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ الٹے پاؤں باہر آیا۔ اس نے غسل خانہ اور رفع حاجت کی جگہ دیکھی، مگر وہ اسے وہاں بھی دکھائی نہ دی۔ تب وہ عمارت میں ہر طرف گیا۔ روشی اور امتیاز کا بچہ کب کے سو چکے تھے۔ عبدالرحمٰن کی کوٹھری میں بھی سکوت طاری تھا؛ اس کے سانس لینے یا پنکوڑا ہلنے کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ ظفر نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ہونا اپنی گردن تک کمبل اوڑھے بےسُدھ سو رہا تھا۔ اس کے پورے آدمی جیسے داڑھی والے چہرے، اور پنکوڑے کی مختصر حد میں اس کے باقی ماندہ ڈھکے ہوئے جسم پر ایک نظر ڈالنے سے یہی لگتا تھا گویا ٹانگوں کے بغیر کوئی اپاہج شخص پڑا ہو۔ ظفر دوبارہ ساجھی کے کمرے میں آیا۔ وہ پہلے کی طرح خالی تھا۔ اس نے راہداری میں دم بھر کے لیے رک کر اپنے حواس بجا کیے، اور پھر اپنے کمرے سے اپنا کوٹ اور ٹارچ اٹھا کر تیزی سے عمارت سے باہر نکل گیا۔

باہر ہُو کا عالم تھا۔ رات کے اس سمے پہاڑوں پر پھیلے جنگل میں اس قدر خاموشی تھی جس کا اندازہ ممکن نہیں۔ ظفر ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر ڈالتا اور ساجھی کو آوازیں دیتا ہوا اونچے نیچے راستے دیواند وار طے کر رہا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے علاوہ کسی مقصد و مرام سے باخبر نہ تھا، گویا اس کی تلاش اس کے اپنے وجود سے علیحدہ اس کا کوئی حصہ ہو گئی ہو۔ وہ کتنی ہی دیر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور اس کا پورا وجود تھکن سے نڈھال تھا۔ اس کی نگاہیں جو بُجھی بُجھی جا رہی تھیں، ساجھی کو دیکھتے ہی روشی ہو جانا چاہتی تھیں۔ اس نے ایک دفعہ پھر اسے آوازیں دیں اور ٹارچ کی روشنی سے بھی پرے دیکھنے کی کوشش کی۔ معاً اسے اپنے عقب میں بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جلد ہی ایک آدمی ہانپتا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

بشیر کا سانس بحال ہوا تو اس نے اپنا تعارف کرایا، اور ساجھی کے بارے میں دریافت کیا۔ ظفر نے مختصر الفاظ میں اسے جھاڑیوں میں گرا ہوا پانے، اسے اپنے ہاں لانے، اور پھر اس کے اچانک لاپتا ہونے کا ذکر کیا۔ بشیر نے اسے بتایا کہ وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے اسے تلاش کر رہا ہے، اور اس کا جائزہ لینے سے یہ بات سچ دکھائی دیتی تھی۔ اس کے کپڑے کئی جگھوں سے تار تار تھے اور درختوں کی جھکی شاخوں، انواع و اقسام کی جھاڑیوں اور لمبی نوکیلی گھاس میں سے گزرنے سے اس کے چہرے اور جسم کے باقی حصّوں پر خراشیں آئی تھیں۔ خود اسے تلاش کر کے اس کی تیمارداری کی ضرورت تھی، مگر وہ ساجھی کو ڈھونڈنے کی مسلسل تگ و دو میں رہا تھا۔

"اب ہم کہاں جائیں؟" بشیر نے ظفر سے پوچھا، "آپ کو علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہو گی؟"

"بالکل نہیں۔ میں خود کافی دیر سے اس کی تلاش میں ہوں۔"

وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئے۔ پہلے انھیں اِکا دکا گھر اور بجلی اور ٹیلیفون کے کھمبے

Scanned with CamScanner

دکھائی دے جاتے تھے، مگر اب چہار سو مکمل سنسانی تھی۔ اس ماحول میں درخت، زمیں اور اپنے متحرک وجود انھیں جیسے پسِ خواب-دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کچّے راستے پر چلنے لگے جو اونچے اونچے درختوں کے بیچ میں سے ایک ڈھلوان کی صورت میں نیچے جاتا تھا۔ وہ یہاں سے گزر کر درختوں کے جُھنڈ سے باہر نکلے تو انھیں اپنے سامنے وسیع و عریض پھیلی وادی دکھائی دی، دور جس کے اختتام پر جگ جگ آگ کے الاؤ روشن تھے۔ وہ ساکت و جامد کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً بشیر نیچے کو بھاگا۔ ظفر اس کے پیچھے گیا۔ نیچے پہنچ کر انھیں چند ایک چھوٹے بڑے ٹیلے عبور کرنے پڑے، اور اندھیرے کو کُھرچ کرتے الاؤ کئی بار ان کی نظروں سے اوجھل ہوے۔ وہ بےتحاشا دوڑ رہے تھے؛ کچھ تو انھیں اپنے اجسام کی قوت میسّر تھی اور کچھ ڈھلوان ان کی مدد کر رہی تھی۔ روشن جگ اب ان سے زیادہ دور نہیں تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر آگ کے چند درخت اپنے تنوں سے لے کر اپنی چوٹیوں تک دھڑا دھڑ جل رہے ہیں، اور ان کے گرد لوگ رقص کر رہے ہیں اور ڈھول بجا رہے ہیں۔ انھوں نے اور تیزی سے بھاگنا شروع کیا اور بالآخر اس جگ پہنچ کر بےدم ہو کر زمیں پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چھ بلند و بالا درختوں سے اُٹھتے آگ کے شعلے گویا آسماں کو جلانے کے درپے تھے، اور قریب ہی پچیس تیس مرد و زن بےخود ہو کر ناچنے اور گانے بجانے میں مصروف تھے۔ ساجھی ان میں شامل تھی اور وہ اکیلی ناچ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ کبھی ایک دائرے میں گھومتی اور کبھی اپنے ہی جسم کے تعاقب میں لاپتا ہوتی دکھائی دیتی۔ اس اندھے غیرساکی پیکر کی طلسماتی حقیقت میں وہ لپک اور چمک تھی جو دہکتی آگ سے زیادہ منوّر تھی۔ اس کا ہر لمحہ حرکت پذیر وجود گویا کائنات کی گردش میں مدغم ہو رہا تھا۔ گروہ کے دوسرے لوگ اس کے اردگرد ناچتے ہوے اسے داد دینے لگے۔ ان کا تعریفی جوش و جذبہ قابلِ دید تھا۔ تب اچانک تیز ہوا چلنے لگی، اور آگ کے درخت بحری جہازوں کے بادبانوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ ان کے جلتے تنوں سے آگ بھڑکاتی شاخ یا ان کا کوئی حصہ آواز کے ساتھ نیچے گرتا تو ڈھول کی تھاپ اور تیز ہو جاتی۔ یہ برق تپاں منظر ظفر اور بشیر کے سارے خیالات کو راکھ کیے دے رہا تھا۔ اب ساجھی کا رقص تھم رہا تھا۔ وہ اپنی بند آنکھوں کے ساتھ نیم مدہوشی کے عالم میں تھرکتی ہوئی ایک ایسی علامتی تخلیق تھی جس کا کوئی خالق نہ ہو۔ ناگاہ قدرت کے آنسو بہنے شروع ہوے اور درخت دھواں دیتے ہوے بجھنے لگے۔ لوگ بارش میں وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ کوئی بھی کسی کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ یہ لوگ نہ جانے کون ہیں؟ کہاں سے آئے تھے اور کہاں جا رہے ہیں؟ ظفر اور بشیر نے جا کر ساجھی کو تھام لیا۔ اس نے ان کا لمس پہچان لیا اور خاموش کھڑی رہی۔ کچھ دیر تک وہ پیدل چلتے رہے اور پھر انھیں ایک لاری مل گئی۔ یہ اس سے اترے تو صبح بیدار ہو رہی تھی۔ اس پہاڑی دشت میں پرندوں اور ہوا کا ایک عجیب لڑکپن تھا۔ بشیر نے ظفر کو اس جگ کا پتا بتایا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا، اور اس سے — پھر کو وہاں ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ظفر نے آنے کا وعدہ کیا۔ وہ ان سے جدا ہوا تو اس کے عجیب احساسات تھے۔ اسے رہ رہ کر ساجھی کا خیال آتا تھا۔ اس نے ایسا ناچ کہاں سے سیکھا تھا؟ پرندے اڑان کیسے سیکھتے ہیں؟ مچھلی پانی میں تیرنا کیسے جانتی ہے؟ اسے اپنے

سوال کا جواب مل گیا۔ ساجھی اور اس سے وابستہ سب کچھ ایک ہی حقیقت تھی۔

ظفر جب اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو تھکن سے چُور تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ اسے نیند کی آغوش میں بےآواز و بےسمت بہہ جانے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سو کر اٹھا تو اسے روشی اور امتیاز کا بچہ کہیں دکھائی نہ دیے۔ اس نے سوچا وہ اسے لے کر امتیاز سے ملنے ہسپتال گئی ہو گی۔ وہ بشیر سے ملنے روانہ ہو گیا۔

بشیر اسے نشست گاہ میں لے گیا، اسے بیٹھنے کے لیے جگ پیش کی اور، یہ کہتے ہوے کہ وہ ابھی واپس آتا ہے، کمرے سے باہر چلا گیا۔ ظفر کو یہاں بیٹھے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ سیما اپنے اکیلے ہاتھ میں چائےدانی اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس نے اسے سامنے پڑی میز پر رکھ دیا اور واپس چلی گئی۔ ظفر اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ دوبارہ دکھائی دی۔ اس دفعہ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک ٹوکری تھی۔ اس نے اس میں سے چائے کے کپ اور پرچیں نکال کر چائےدانی کے قریب قرینے سے رکھ دیں اور ظفر کو ایک عجیب غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں نہ جانے کیا کرب تھا اور کیا جاننے یا نہ جاننے کی خواہش۔ ظفر ابھی کچھ بھی سمجھنے نہ پایا تھا کہ وہ چپکے سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بشیر اندر داخل ہوا۔ اس نے اس کے اور اپنے لیے چائے انڈیلی۔

"ساجھی کا کیا حال ہے؟" ظفر نے اس سے پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک سو رہی ہے۔"

"اسے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"کیسی چوٹ؟" بشیر نے حیرت زدہ ہوتے ہوے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے --- میں ایسے ہی شُبے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا وہ کہیں گر نہ پڑی ہو۔"

"میں اسے بحفاظت یہاں لے آیا تھا۔ اپنی بہنوں سے مل کر وہ بہت خوش ہوئی۔"

"کیا وہ لڑکی جو ابھی یہاں تھی، جس کا ایک بازو نہیں ہے، ساجھی کی بہن ہے؟"

"ہاں۔ اس کا نام سیما ہے۔ وہ بڑی اچھی اور سعادت مند بچّی ہے۔ کیا آپ یہیں کہیں رہتے ہیں؟"

"جی نہیں، میں ہالینڈ میں رہتا ہوں اور ادویات بنانے کی ایک فرم میں ملازم ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ شادی سے پہلے آپ کی ہونے والی بیوی آپ کے رشتےداروں میں تھی؟"

"اس وقت میرا کوئی رشتےدار نہیں تھا،" بشیر نے اپنے قلب و جگر کی گہرائی میں کہیں تڑخ کر جواب دیا۔ "تب میں کسی کو بھی نہ جان سکا تھا۔ اب یہی میرے رشتےدار ہیں، یا میرے ابّاجان، اور ایک سوتیلا بھائی جو امریکا میں ہے۔" بشیر کے باتیں کرنے کا انداز رقت انگیز تھا۔ اس کے لب و لہجے سے درد اس طرح نچڑتا ہوا محسوس ہوا جیسے تازہ زخموں سے خوں۔

ظفر کو فیاضی کا خیال آیا جس سے وہ افتخار کے کہنے پر مل چکا تھا، اور اسے واپس

Scanned with CamScanner

شہر جا کر اس سے دوبارہ ملاقات کرنی تھی۔ فیاضی نے اسے بتایا تھا کہ اس کا ایک بیٹا ایک زرعی فارم پر کام کرتا ہے اور دوسرا امریکا میں رہائش پذیر ہے۔ ظفر نے بشیر سے اس کے باپ کا نام پتا پوچھا، اور فیاضی کے بارے میں جان کر اسے حیرت ہوئی۔

"کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟" بشیر نے اس کے تاثرات بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں ان کے لیے اپنے ایک دوست افتخار حمید کا ایک پیغام لے کر آیا تھا۔"

"افتخار کا میرے والد صاحب سے کیا تعلق ہے؟" بشیر نے اس سے پوچھا۔

"میں ان کے آپس میں تعلق کی حقیقت نہیں جانتا۔ جو کچھ اس نے مجھے ان کے لیے کہا تھا، وہ میں نے انہیں بتا دیا۔ آپ شاید نہ جانتے ہوں کہ اس ملک اور اس میں بسنے والے بیشتر لوگوں پر ایک ناپسندیدہ تقدیر مسلّط کی جاتی رہی ہے، اور موجودہ دور میں تو ناانصافی کی انتہا ہو گئی ہے۔"

بشیر کو خاموش پاکر ظفر پھر بولا، "میری بات غور سے سنیں، ہمیں آپس میں متحد ہونا ہے اور ان جعلی قوتوں سے ٹکرانا ہے جو ہمارے لیے دکھ درد کے کانٹے بو رہی ہیں۔ ہمیں بند دروازوں کو کھولنا ہے، اور اگر یہ نہیں کھلتے تو ہمیں ان کو اکھاڑ پھینکنا ہے، ورنہ ہم بند اور مسموم فضا میں دم گھٹ کر مر جائیں گے۔ میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ موجودہ حالات کو چپ چاپ قبول کرنے کا مطلب اپنے آپ سے غدّاری ہے۔ ہم سے پرانے زمانے کے حبشی غلاموں کا سا سلوک کیا جا رہا ہے۔ مذہب کے نام پر ہمارا استحصال ہو رہا ہے، اور یہ ایسے لوگ کر رہے ہیں جن کی دوغلی ذہنیتیں اور دوہری شخصیتیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ میں یہاں بہت سے لوگوں سے ملا ہوں، جن میں ڈاکٹر، استاد، طلبا، دکاندار، مزدور، دفتروں میں کام کرنے والے اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔ وہ موجودہ صورت حال سے بالکل مطمئن نہیں ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کھل کر اظہار خیال کیا تو مجھے ان کی سانسیں جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔"

"اس ملک میں گزشتہ چند برسوں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، میں ان سے کوئی خاص بدظنی نہیں ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کبھی کبھی میں سخت بےچینی اور اداس ہو جاتا ہوں۔"

"وہ تبدیلیاں جو یہاں آئیں اور جن سے آپ بدظنی نہیں ہیں، اگر وہ خوش آئند تھیں تو پھر کسی کو بھی بےچین یا اداس ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ ہماری اداسیوں یا بےچینیوں کی وجہ اور ماخذ کچھ بھی ہو، یہ ہمیشہ تلخ اور ناخوشگوار ماحول میں پروان چڑھتی ہیں، اور افتخار کی یہ بات واقعی قابل غور ہے کہ پریشانیوں یا تکلیفوں کی پیدائش اتنی اہم نہیں ہوتی، جتنا ان کا دور حیات۔"

"ایک دفعہ افتخار میرے والد صاحب کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ اس نے مجھ سے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں۔ میں جاننا چاہوں گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

"وہ ذاتی طور پر کچھ نہیں چاہتا، بلکہ ہمیں کچھ چاہنے اور کرنے کا احساس دلانے کا آرزومند ہے۔ چند روز بعد مجھے اور میرے دوست کو واپس یورپ جانا ہے، مگر آپ لوگ، جن کا مسائل سے سامنے کا اور براہ راست تعلق ہے، کیوں سُن ہوئے بیٹھے ہیں؟"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ سیما کمرے میں آئی اور اس نے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں کسی

چیز کی ضرورت ہے۔ ظفر نے اسے بتایا کہ وہ پانی پینا چاہتا ہے، اور اس نے اسے شفقت سے دیکھا۔ سیما نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے تاثرات میں وہی پہلے کی سی حیرت زدہ تنہائی ثبت رہی جو اس کے چہرے کے خدوخال ہی کا جزو دکھائی دیتی تھی۔ وہ پانی سے بھرا گلاس لے آئی اور اسے ظفر کے سامنے میز پر رکھ کر بےدلی سے واپس ہوئی۔ اس کی اداسی متوجہ کی تھی، یوں لگتا تھا جیسے وہ ناگفتہ بہ حالات کو آنسوؤں میں گوندھ کر بنائی گئی ہو۔ وہ کمرے سے باہر جا رہی تھی تو ظفر کو گماں گزرا، گویا وہ چھوٹے بڑے قدم اٹھاتی ہوئی گئی ہو۔ پانی پی چکنے کے بعد ظفر چپ رہا۔ اس کے خیالات عجیب طرح سے آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اس نے گلاس میں سے چند گھونٹ اور لیے، اور بولا، "ہمیں بےبسی اور ناتوانی کے جالے اتار پھینکنے ہیں اور ایک نیا ماحول سامنے لانا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے نقصانات کا اندازہ لگائیں اور دلیر اور بےباک ہو کر اپنے تحفّظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ ہم اپنی آزادی اور سلامتی کو دوسروں کے آگے رہن رکھنے والوں کو نہیں بخشیں گے، اور انہیں ضرور دبوچیں گے جو ہمارے مستقبل کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" بشیر نے پوچھا۔

"جناب، آپ اس ملک میں رہتے ہیں اور آپ کو معلوم نہیں ہے یہاں کیا ہو رہا ہے؟ بڑی طاقتوں کے آگے ہماری قسمت کی نیلامی ہوتی ہے، اور جو زیادہ دام لگاتا ہے رقم کھری کر کے ہمیں اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ ایک خوفناک دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں اور ہمیں اس طرف لے جانے والے عیش و آرام کی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ غیر ممالک میں ان کے خفیہ بینک اکاؤنٹ ہیں اور ان پر نازک وقت آنے پر ان ممالک کی حکومتوں نے ان کی اپنے ہاں حفاظت کی ضمانتیں دے رکھی ہیں، مگر ہمیں ان کو یہیں پکڑنا ہے، ان کے سارے راستے مسدود کر کے انہیں یہیں زندہ درگور کرنا ہے۔"

"میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے،" بشیر نے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ سب لوگ خوشحال اور خوش و خرم رہیں۔"

"ہمارا بھی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور ہماری خواہش بھی آپ جیسی ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔ لوگ ڈرے ہوئے ہیں، خوفزدہ ہیں اور ایک نامعلوم کے ہاتھوں میں قید ہیں۔ ان کا ڈر، خوف اور گم گشتگی ان کے اذہان میں پنپتی ہے، اور ان عناصر سے بنی نئی نسل انہیں اپنے پیچھے آتی دکھائی دیتی ہے۔"

بشیر نے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کبھی اس کی آنکھیں بند ہوتیں اور کبھی ان سے تفکّرات کی پرچھائیاں لرزتی دکھائی دیتیں۔ ظفر بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا،

"اگر ہم ڈرے اور سہمے رہے تو ہماری قبروں پر بزدلی اور ذلّت کے کتبے نصب ہوں گے، اور اغیار ہمارا ذکر ہنسی مذاق کے طور پر کیا کریں گے۔ ہمیں بےدھڑک ہو کر مقابلے کے لیے نکلنا ہے۔ یہ ہماری باہمی بقا اور سلامتی کا سوال ہے۔"

بشیر نے ایک ہی سمت میں یکسوئی سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔ واضح نہیں تھا کہ اس نے اس کی باتیں سمجھی ہیں یا وہ اپنے خیالات میں گم ہے۔ ظفر نے اس سے کہا

Scanned with CamScanner

کہ وہ واپس جا رہا ہے، ممکن ہے اس کی اس سے پھر ملاقات ہو۔

ظفر اپنی قیام گاہ میں داخل ہوا تو اس نے سوچا وہ عبدالرحمٰن کو اپنے سامان وغیرہ کی نگہداشت کرنے کا کہہ کر، اور روشی اور امتیاز کے بچے کو اپنے ساتھ لے کر امتیاز سے ملنے ہسپتال جاتا ہے۔ اس کے عبدالرحمٰن کی کوٹھری پر دستک دینے پر کوئی جواب نہ آیا تو اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوٹھری کی اندرونی حالت تقریباً پہلے جیسی تھی، سوائے اس کے کہ اسٹول پر مالٹوں کے چھلکے پڑے تھے۔ وہ نشست گاہ میں آیا۔ وہاں امتیاز اپنے بچے کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی طبیعت بہتر دکھائی دیتی تھی۔

"تم کب آئے ہو؟" ظفر نے اس سے پوچھا۔ "اب تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے؟"

"میں چند گھنٹے قبل لوٹا ہوں اور خود کو بالکل تندرست پاتا ہوں۔"

"روشی کہاں ہے؟"

"وہ چلی گئی ہے۔" امتیاز کی آواز جذبات سے عاری تھی۔

"کیا؟" ظفر نے تعجّب سے کہا۔

"میں کل صبح اسے اس کے والدین کے پاس چھوڑ کر آنا چاہتا تھا، مگر وہ خود ہی روانہ ہو گئی۔" امتیاز نے اس سے کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اسے واپس بھیجنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ شادی ٹھیک نہیں تھی۔" امتیاز کا لہجہ ترش ہو گیا۔ میرے چند رشتےداروں کی خواہش سے یہ رشتہ طے ہوا تھا، جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا، مگر میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جو بیوی مجھے ملے گی وہ عجیب و غریب کردار کی مالک ہو گی۔ ہسپتال سے یہاں آنے پر مجھے اپنے کمرے میں چارپائی پر لحاف کے نیچے کھسرپھسر سنائی دی۔ میں نے اسے کھینچ کر ایک طرف کیا تو میں نے اپنے سامنے ایک حیرت انگیز خواب رینگتا ہوا پایا۔ دو ڈھائی فٹ کا ایک بونا اس کے ننگ دھڑنگ جسم کے ساتھ لپٹا اس کے پستان چوس رہا تھا۔ اگر وہ داڑھی کے بغیر ہوتا اور مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہ دیتا تو میں انہیں یقیناً ماں بیٹا تصوّر کرتا۔ وہ فوراً بستر سے کودا اور آناً فاناً کمرے سے بھاگ گیا۔ مزید کوئی بات کرنا فضول تھا۔ مگر وہ بونا کون تھا؟ مجھے تو یوں لگا جیسے وہ اس جنگل کا کوئی جانور تھا جو راہ بھول کر یہاں آ گیا تھا۔"

"میں اس جانور کو جانتا ہوں۔ اس کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ جس آدمی نے ہمیں ٹھہرنے کے لیے یہ جگہ دی ہے، وہ اس کا رشتےدار ہے۔ یہ کہیں گیا ہوا تھا اور کل ہی لوٹا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے اس کی کوٹھری ہے۔ میں ابھی ابھی وہاں سے ہو کر آیا ہوں اور لگتا ہے کہ وہ دودھ پینے سے پہلے مالٹے کھا رہا تھا۔"

"کیا تم اس سے مل چکے ہو؟ تم نے مجھے بتایا نہیں؟"

"تمہیں بتاتا کب؟ ابھی تو تم سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔" ظفر نے مختصراً اسے روشی کے اپنی چھاتیاں کھرچنے کے متعلق بتایا، اور اسے کہا کہ جو واقعہ اسے پیش آیا ہے، اگر یہ نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی اسے اس بارے میں آگاہ کرنا تھا۔"

"اچھا ہوا مجھے اس کی اصلیت کا پتا چل گیا ورنہ وہ ہمارے ساتھ یورپ جا کر نہ جانے کیا گل کھلاتی۔"

"یہاں تو شادیوں پر بڑے بڑے گھپلے، فراڈ اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔ صرف اپنی موت پر ہی انسان لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ رہتا ہے۔"

انہوں نے اگلے روز یہاں سے روانہ ہونے کا پروگرام بنایا اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔

وہ لاری میں سوار واپس شہر جا رہے تھے۔ انہیں کچھ فاصلہ سڑک کے ذریعے، اور باقی ماندہ سفر ریل گاڑی سے طے کرنا تھا۔ امتیاز اپنے بچے کو گود میں لیے، لاری کی سیٹ سے ٹیک لگائے اور اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کا بچہ بھی اپنی آنکھیں میچے ہوئے تھا۔ ظفر ان کے ساتھ بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اسے پچھلی سیٹ پر بیٹھے دو آدمیوں کی گفتگو سنائی دینے لگی۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا،

"جناب جی، اب ولی دریافت ہوئی ہے۔ وہ لوشے دیتی ہے جس کا جواب نہیں ہے۔"

"سفر کا اصل ساتھی افیم ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "لاری یا ریل گاڑی میں بیٹھے ہوئے چھوٹے بڑے گاؤں اور شہر پلک جھپکتے گزرتے ہیں۔"

"چھوڑیں جی، افیم بڑا کتا نشہ ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ بادشاہوں اور شہزادوں سے اس کا تعلق چلا آ رہا ہے۔ میں تو اس علاقے میں آیا ہی اس کے لیے تھا۔"

پھر وہ چاولوں کی مختلف اقسام، زراعت، اور اپنے خاندانوں میں شادیوں اور لڑائی جھگڑوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ظفر کو ان کی باتیں تواتر سے سنائی دے رہی تھیں۔ ذرا دیر بعد لاری رکی تو وہ اس کے قریب سے ہو کر نیچے اتر گئے۔ ان کے جانے کے بعد اُبلے ہوئے انڈے بیچنے والا ایک لڑکا اندر داخل ہونے کو لپکا، جسے دیکھتے ہی کنڈکٹر نے غصے سے کہا، "پچھلی دفعہ تم مجھے گندے انڈے دے گئے تھے۔"

"نہیں جناب ---"

"نہیں جناب کیا؟ تم مجھ سے دغا کرتے ہو۔"

"اچھا جی، معافی چاہتا ہوں۔"

کنڈکٹر، جو دروازے میں اپنی ٹانگ اٹکائے راستا روکے کھڑا تھا، ایک طرف ہو گیا اور اس نے لڑکے کو اندر آنے دیا۔ اس کے پیچھے ایک بھکاری نے بھی اندر آنا چاہا، جسے کنڈکٹر نے پرے دھکیلتے ہوئے کہا، "جا دفع ہو۔" اور دروازہ بند کر کے ڈرائیور کو دیکھتا ہوا چیخ کر بولا، "چلو جی۔"

امتیاز نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں، جبکہ اس کا بچہ ہنوز آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ظفر اسے محویت سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً اسے کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ ڈرائیور کے قریب سیٹ پر بیٹھا کوئی مسافر انڈے بیچنے والے سے الجھ رہا تھا۔ کسی نے پیچھے سے بلند آواز سے کہا، "اوئے، گرمیوں میں اُبلے ہوئے انڈے بیچتے ہو؟"

Scanned with CamScanner

لڑکے کے پاس اس کا جواب تیار تھا۔ وہ پلٹ کر بولا، "جناب، انڈے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد ہوتے ہیں۔"

اس پر لاری کے مختلف گوشوں سے ہلکی، دبیز، کھنکارتی اور کھانسی سے مشابہ ہنسی سنائی دی۔ لاری ایک مرتبہ پھر رک رہی تھی۔ انڈے بیچنے والا لڑکا نیچے اترنے کو تھا کہ کنڈکٹر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹوکری سے دو انڈے اٹھا لیے اور ایک ڈرائیور کی طرف اچھالتے ہوئے بولا، "میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

اس کی غیرموجودگی میں دو بھکاری جلدی سے لاری میں داخل ہوئے اور آہ و زاری کرتے ہوئے بھیک مانگنے لگے۔ ان میں سے ایک خواتین کے پاس کھڑا ہو جاتا اور اس وقت تک بڑبڑاتا اور گڑگڑاتا رہتا جب تک عورتیں یا ان کے مرد اسے کچھ دے نہ دیتے، یا اسے جھڑک کر دور نہ کر دیا جاتا۔ دوسرا بھکاری بڑا مکروہ صورت اور بدبودار تھا۔ اس کے جسم پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ اسے بھیک جذبۂ ترحم یا خدا ترسی کی وجہ سے نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے خود سے دور کرنے کی خاطر کچھ نہ کچھ اس کی جھولی میں ڈال دیتے تھے۔ کنڈکٹر سگریٹ کا پیکٹ لیے واپس آیا تو بھکاریوں کی سٹی گم ہو گئی۔ ان کی آہ و زاری اور واویلا یک لخت تھم گیا، اور وہ جلدی سے نیچے اترے۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتاتے تھے جیسے وہ کنڈکٹر سے دھکا کھانے کی توقع رکھتے ہوں، مگر وہ اتنے گندے تھے کہ اس نے انہیں چھونا تک گوارا نہ کیا۔ لاری چلی تو کنڈکٹر نے بیک وقت دو سگریٹ اپنے لبوں میں داب کر سلگائے اور ایک ڈرائیور کو دیتے ہوئے بولا، "ان مادر... بھکاریوں کو کبھی اندر نہ آنے دیا کرو۔"

"وہ اندر آ جائیں تو میں ان پر لاری دوڑانے سے تو رہا۔" ڈرائیور یہ کہہ کر ہنس دیا۔

کنڈکٹر نئے آنے والے مسافروں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں ٹکٹ دینے لگا۔ وہ جگہ، جہاں سے ظفر اور امتیاز کو ریل گاڑی کے ذریعے سفر کرنا تھا، آئی تو وہ بچے کے ساتھ لاری سے اترے۔ ریل گاڑی انہیں لیے برق رفتاری سے ان کی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

منزلیں سر کرتے کرتے وہ ان میں سے ایک کی طوالت، حجم اور رفتار میں تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان سے دور وقت اور فاصلے پر چلتی ریل گاڑی کے اسی ڈبے میں ایک لڑکی نے نشہ آور گولیاں کھا کر خودکشی کی تھی۔ گولیوں کی خالی شیشی، جس پر نہ جانے کیوں اور کس نے ماچس کی ڈبیا کا لیبل چسپاں کیا تھا، اس کی گود میں اپنے ڈھکن کے ساتھ کھلی پڑی تھی، اور وہ اپنے سر سے نشست پر گرے اپنے دوپٹے سے بےنیاز ایک سفر میں رہتی ہوئی دوسرے سفر پر گامزن تھی۔ اس کا پہلا سفر، ایک مختصر سا وقفہ ڈال کر، ہسپتال کے اس وارڈ میں ختم ہوا تھا جہاں کچھ عرصے بعد اس کا باپ اسی راہ سے ایک نامعلوم مستقبل میں داخل ہونے پہنچا تھا۔ یہ مستقبل جو ان کے لیے زمین دوز گڑھوں سے اپنی سمت کا آغاز کرتا تھا، اپنے اوپر نمدار مٹی، ادھ جلی اگر بتیوں اور اپنی شاخوں سے جدا کیے اور مرجھائے ہوئے پھولوں کا غیروزنی بوجھ لیے ہوئے تھا۔ سنیما مینجر کا بوڑھا باپ، اس کی خودکشی کرنے والی بہن اور کھجلی زدہ پستانوں والی بیوی اس کی زندگی کی فلم سے نکل چکے تھے۔ وہ دور دراز کے علاقے میں سائیکلوں کی دکان کی آڑ میں منشیات کے کاروبار میں شریک ہونے پہنچا تھا، اور ایک ہونے کو

اپنے ماضی و حال کی کچھ نشانیاں دے کر دو بھائیوں کے ساتھ ہزاروں اور لاکھوں کی فکر میں تھا، اور اسے بھی علم نہیں تھا کہ جیسے بعض بندسوں کے کچھ حصے مٹ جانے اور ان میں چند خطوط کے شامل ہونے سے ان کی تعداد بدل جاتی ہے، ایسے ہی بعض لوگوں کی عادتوں میں کمی بیشی سے ان کی شخصیات بدل جاتی ہیں۔ لیکن وقت نہیں بدلتا، بلکہ مختلف زمانے اس میں متغیر رہتے ہیں، جیسا کہ ٹائی ماؤتھ کے قریب ایک پرانے قبرستان میں انہوں نے اپنے تاثرات چھوڑے تھے۔ وہاں قبروں کے سنگی کتبوں کے الفاظ گردش شام و سحر کی مسلسل طوالت میں جھڑ کر کچھ یوں عجیب و غریب اشکال اختیار کر گئے تھے جیسے منجمد لہریں ہوں، یا پھر کسی نادیدہ مخلوق کے تصوراتی خد و خال۔ افتخار حمید اس جگہ کافی دیر سے بیٹھا اپنی یادداشت کے دریچوں سے باہر دیکھنے کی کوشش میں تھا۔

(زیرِ تحریر ناول کا ایک باب)

اسد محمد خاں

کی تحریروں کا نیا مجموعہ

برجِ خموشاں

سیفورٹیز

سی ۱۴ شہریانو پلازہ فیڈرل بی ایریا کراچی

Scanned with CamScanner

آج

سالانہ خریداری

اندرونِ ملک

چار شماروں کی قیمت ۱۰۰۰ روپے

بیرونِ ملک

امریکا اور کینیڈا کے لیے

چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۲۰۰ امریکی ڈالر

بھیجنے کا پتا :

Prof. Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street
Madison, Wisconsin 53705
U.S.A.

انگلینڈ اور باقی ممالک کے لیے

چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۱۵۰ پاؤنڈ

بھیجنے کا پتا :

Ms. Shabana Mahmud
52, Queen's Road
Wimbledon
London SW19 8LR
England.

محمد خالد اختر

ہندوستان کی سرسری تاریخ ۔ ۳

باب ہشتم

نند اول، دوم، سوم، چہارم وغیرہ ـــ نو ناقابلِ برداشت بادشاہ

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے (ویسے ہمارا حافظہ ایک مدت سے جواب دے چکا ہے؛ اگلے دن ہم اپنے نام بھول گئے، اور اپنے ایک دوست سے درخواست کی کہ وہ ہمارے نام سے ہمیں بلائے) ہم پرنس سدھارت گوتم بدھ کے بیان سےپہلے مگدھ کے بادشاہوں، بمبا چھترو، اجیت چھترو اور نندوں وغیرہ کا ذکر کر رہے تھے۔ ہم اب اپنے پڑھنے والوں کی واپس نندوں کو طرف لے چلتے ہیں (ویسے یہ نند مرد تھے)۔ بدھ صحیفوں اور پُرانوں کے مطابق آخری چھترو (یا کھیرو) مہانند تھا۔ یہ مہانند چھترو قدرے کم زور بادشاہ تھا، چنانچہ اس کی بیویاں (قدرتاً) اپنی من مانی کرتی پھرتی تھیں۔ اس نے ایک نیچ جات عورت موریا سے بیاہ رچایا۔ یہ موریا اچھی عورت نہ تھی اور آفت کی پرکالہ نکلی۔ وہ شاہی حجام مہاپدم نند پر ریجھ گئی، جو مہانند کھیرو سے زیادہ خوش شکل اور جوان تھا، اور ایک رات دونوں نے مل کر بیچارے کھیرو کو سوتے میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا (جو یقیناً اچھی بات نہ تھی)۔ اس چالاک حجام مہاپدم نند نے رانی موریا سے بیاہ کر لیا، اور چیف آف دی آرمی اسٹاف جرنیل ہوگی (ب پر پیش دے کر پڑھو) سے سازباز کر کے مگدھ کے تاج و تخت کا مالک بن بیٹھا۔ اس طرح مگدھ کی سلطنت پچاس برس کے لیے نندوں کے ہاتھ آ گئی۔ کھیروں سے لوگ تنگ آ چکے تھے، اور انھوں نے حکومت کی تبدیلی کو "ویلکم" کیا کہ شاید ان کے دن پھر جائیں۔ مگر وہ نندوں کو نہیں جانتے تھے، اور نہ یہ کہ وہ ان کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ ان نندوں کے متعلق ہم خوش قسمتی سے زیادہ نہیں جانتے۔ بدھ صحیفوں اور پُرانوں میں ان کے احوال کافی کنفیوزنگ ہیں، اور نند خود بھی کافی کنفیوزڈ بادشاہ تھے۔ حجام بادشاہ مہاپدم نند کو پرانوں میں "سب کھشتریوں کا غارت گر اور

Scanned with CamScanner

بےمثل مہاراج ادھیراج" بتایا گیا ہے۔ ظاہرا یہ نند اوّل اپنے وقتوں کا نپولین تھا، اور اس نے اپنی چال بازیوں اور جنگ آزمائیوں سے پڑوسی مملکتوں کو فتح کر کے سلطنت کی کافی توسیع کی۔ ویسے نند اوّل بہت بدمزاج اور محسن کُش تھا۔ مگدھ کے تخت پر قبضہ جمانے کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے بےچارے جرنیل بوگی (پیش کے ساتھ پڑھو) کو اس کے عہدے سے برطرف کر کے ایک آہنی پنجرے میں قید کر دیا۔ اس پنجرے کو شاہی محل کے باغ کے ایک گوشے میں دوسرے حیوانات کے پنجروں کے ساتھ رکھوا دیا گیا، اور مہاپدم یا نند اوّل اکثر وہاں پنجرے کی سلاخوں میں سے اپنے سابق چیف آف دی آرمی اسٹاف سے گفتگو کرنے جایا کرتا۔ پہلے پہل بوگی مغلظات بکتا تھا جو چھاپی نہیں جا سکتیں، مگر بعد میں چپ چپ سا رہنے لگا اور نند اوّل کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیتا۔ آخر کار ایک سال پنجرے میں رہنے کے بعد بےچارے بوگی کا دماغ چل گیا اور وہ پاگل ہو گیا۔ (بوگی کی جگہ ہم ہوتے تو ہم بھی ہو جاتے۔) بعد میں نند اوّل نے اس رحم پر کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا، اور بوگی نے اپنی بقیہ زندگی پاٹلی پُتر کے شوجی کے مندر کی سیڑھیوں پر دوسرے سینکڑوں بھکاریوں کے ساتھ بھیک مانگنے اور بدن کی جوئیں مارنے میں گزاری۔ ہا! ہا! نند اول نے پندرہ سال خم ٹھونک کر حکومت کی، اور پھر موت نے اسے آ لیا۔ ایک بدھ صحیفے میں لکھا ہے کہ مہارانی مورنا نے اسے زہر دے دیا تھا، جو اپنے بیٹے نند دوم کو جلد از جلد تخت پر بیٹھے دیکھنا چاہتی تھی۔

نند دوم کو حکومت کرتے ابھی چار ہی سال ہوئے تھے کہ اسے ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک دن بادشاہ جنگل میں شیر کے شکار پر نکلا ہوا تھا کہ شیر نے اسے کھا لیا۔ (اتفاقاً شیر بھی شکار پر نکلا ہوا تھا)۔ کھائے جانے کے بعد، ظاہر ہے، وہ بادشاہ نہیں رہ سکتا تھا، اور کریاکرم کی رسمیں ادا ہونے کے بعد نند سوم مگدھ کے تخت پر بیٹھا۔ نند سوم کے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ سخت کنفیوزڈ اور مخبوط الحواس مہاراج ادھیراج تھا۔ وہ اکثر اپنی مہارانیوں کو ایک دوسرے سے کنفیوز کر دیتا۔ پرمیلا کو سوشیلا سمجھ بیٹھتا، اور راج وتی کو لاجونتی (اگرچہ اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑتا)۔ یہی حال اس کا اپنے وزیروں یعنی منتریوں کے سلسلے میں تھا۔ کبھی کبھی وہ چھتربردار کو راشٹرپتی گمان کرنے لگتا۔ اس نے دو تین ایسی سلطنتوں پر چڑھائی کی جو پہلے ہی فتح ہو چکی تھیں۔ نند چہارم بھی کافی معقولیت پسند، اگرچہ تُندخو اور قدرے جھگڑالو بادشاہ تھا۔ ہر تیسرے چوتھے مہینے اپنے منتری منڈل یعنی کیبینٹ میں آٹھ دس وزیروں کا اضافہ کرتا، اور نئے وزیروں کو وہ محکمے سپرد کرتا جو پہلے ہی دوسرے وزیروں کو تفویض تھے۔ اس سے کافی کنفیوژن پھیلا۔ وزارت کے متمنّی مگدھ کا رخ کرتے۔ گوجرانوالے کا ایک گھوڑوں کا سوداگر پاٹلی پُتر میں گھوڑے فروخت کرنے آیا (چہارم گھوڑوں کا شوقین تھا) اور چار پانچ مہینے بعد خود کو پرورشِ اسپاں کا وزیر بنا دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ مگر وہ صرف گھوڑے بیچنا چاہتا تھا اور کچھ مدّت بعد چوری چھپے اپنے وطن گوجرانوالے بھاگ آیا۔ اس نے اپنا نام بدل ڈالا، اپنی ہیئت تبدیل کی اور گھوڑے لے کر پھر مگدھ گیا۔ اب کے اسے پھر پرورشِ اسپاں کا وزیر مقرر کر دیا گیا۔ جب چہارم سرگباش ہوا تو اس کی کیبینٹ کی تعداد دو سو سے اوپر تھی۔

نند پنجم کے عہد حکومت کا سب سے اہم واقعہ "اسوا پدھا" کے گھوڑے کی گم شدگی ہے۔ یہ مقدس گھوڑا اٹک کے علاقے میں بےلگام، لوگوں کی فصلوں کو منہ مارتا گھوم پھر رہا تھا۔ مگدھ کے فوجیوں کی ایک محافظ پلٹن اس کے پیچھے پیچھے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھی کہ کوئی اسے للکارے اور وہ اس کی گردن ناپیں۔ فوجی دم کے دم سستانے اور گانجا پینے کے لیے رکے۔ پھر جو دیکھا تو گھوڑا غائب۔ پہلے تو انھوں نے سمجھا کہ گھوڑا آس پاس ہی کسی فصل میں گھسا اپنا پیٹ بھرتا ہو گا۔ اس کی تلاش شروع ہوئی، مگر گھوڑے کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، جیسے اسے زمین کھا گئی ہو۔ آتے جاتے راہ گیروں سے پوچھ گچھ کی۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا، بلکہ دو تین نے الٹا سوال کیا، "گھوڑا؟ کون سا گھوڑا؟ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟" مختصراً، برج موہن (یہ گھوڑے کا نام تھا) نہ ملنا تھا نہ ملا، اگرچہ محافظ فوجیوں نے ارد گرد کے سب علاقے اور گاؤں چھان مارے۔ ہم مستقیں کو یقین ہے کہ راج دھانی پاٹلی پُتر سے روانگی کے وقت ہی سے برج موہن کی نیت میں فتور پیدا ہو گیا تھا (ہمارے تجربے کے مطابق یہ گھوڑوں میں کوئی غیر معمولی اور انوکھی بات نہیں)۔ عام تام گھوڑوں سے کہیں زیادہ علیم و فہیم اور دور اندیش ہونے کی بدولت اس نے بھانپ لیا ہو گا کہ اسے رخصت کرتے وقت لوگوں کے جوش و خروش، دھوم دھڑکے اور اس پر گل پاشی وغیرہ کے پیچھے کوئی خاص مقصد کارفرما ہے، اور اس کا انجام اچھا ہونے والا نہیں۔ برجموہن کی گھوڑے کی حس نے اسے بتا دیا ہو گا کہ یہ خوشیاں منانے، ناچنے گانے والے لوگ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ شاید اس نے قربان گاہ اور اس پر پڑے اپنے خون کے چھینٹے دیکھ لیے۔ اس لیے موقع ملتے ہی اپنے محافظوں کو جُل دے کر فرار ہو جانے کی نیت باندھی، اور ان پر یہ ظاہر کر کے کہ وہ سہج سہج گھاس چر رہا ہے، اپنا کرتب دکھا دیا (جو صرف گھوڑے ہی کر سکتے ہیں)۔ اس کی محافظ پلٹن کے فوجیوں نے، یہ جانتے ہوئے کہ مقدس گھوڑے کو کھو دینے پر پاٹلی پُتر میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہو گا، آسام کی پہاڑیوں کی راہ لی، اور ان میں سے کوئی بھی پھر مگدھ کی سلطنت میں نہیں دیکھا گیا۔

برجموہن گھوڑے کے غائب غلّا ہو جانے کی خبر راج دھانی میں پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور چھاتیاں پیٹتے گھروں سے باہر نکل آئے۔ نند پنجم نے بھوجن سے ہاتھ کھینچ لیا (اور بعد میں اس پر غشی کا دورہ پڑا)۔ محافظ پلٹن کے فوجیوں کے خلاف، جنھوں نے گھوڑے کی حفاظت میں کوتاہی کی تھی، غم و غصے کا اظہار کیا گیا، اور ہر ایک نے کہا کہ لوٹنے پر ان کی کھال کھینچ لینی چاہیے۔ (لوگوں کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ آسام چلے گئے ہیں ور اب نہیں لوٹیں گے۔) برج موہن کو کسی نے الزام نہ دیا، جو خود فرار ہوا تھا۔ کوئی یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اتنا مقدس اوتار گھوڑا جان بوجھ کر ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ وشنو کے بڑے مندر کے پروہت وشودت اور دوسرے برہمنوں نے پیشگوئی کی کہ اسوا پدھا کے گھوڑے کے یوں گم ہو جانے سے مگدھ کے طول و عرض میں جلد ہی قحط، وبا، بھونچال اور دوسری آفات کا نزول ہو گا۔ چونکہ ملک کے کسی نہ کسی حصے میں ان آفات کا نازل ہوتے رہنا خلافِ معمول نہ تھا، اس لیے برہمنوں کی پیشگوئی کسی حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ (نند ششم کے عہد میں برج موہن ناگاؤں کے رجا بھمبھارو کے اصطبل میں کمال ضعیفی اور پیری کی

Scanned with CamScanner

حالت میں دیکھا گیا، مگر تب بہت دیر ہو چکی تھی اور وہ اسوا یدھا کے قابل ہرگز نہیں رہا تھا۔) نند ششم تخت پر بیٹھا مگر چونکہ وہ دونوں کانوں سے بہرا اور اس کے ساتھ ساتھ گونگا تھا، اس لیے نند ہفتم نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ششم سے حکومت ٹھیک سے نہیں ہو رہی، ملک کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ اس کے بعد نند ہشتم اور اس مبارک خاندان کا آخری بادشاہ نند نہم آئے۔ نند نہم کی صفات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ وہ نہایت سفلہ خصلت، بےبودہ، حریص، غلیظ اور بخیل بادشاہ تھا۔ بادشاہ ہونے کے باوجود رات کے کھانے سے جو بچ جاتا اسے انھوا دیتا، اور صبح کے وقت بچا ہوا باسی کھانا کھاتا۔ اپنے منتریوں اور امیروں میں شیخی بگھارتا کہ اس طرح وہ صبح کا ناشتہ بچا لیتا ہے۔ اشنان وہ دو مہینے میں ایک بار کرتا، اور اس کی پوشاک اتنی میلی کچیلی ہوتی کہ اس سے بساند آتی اور اس کے درباری اس سے کچھ فاصلے پر ہو کر بیٹھتے۔ اسے دھوبی پسند نہیں تھے (اس کی ماں ایک نیچ جات کی دھوبی تھی)۔ نند نہم کے دربار میں ایک شوخ، بذلہ سنج اور البیلے نوجوان چندرگپت مور نے بڑی رسائی حاصل کر لی، اور اپنی لیاقت ذاتی سے ترقی کر کے مگدھ کی فوج میں کمانڈر ہو گیا۔ نہم نے جو بیحد شکی مزاج آدمی تھا، کسی بات پر ناراض ہو کر اسے ملک بدر کر دیا۔ مور چپ نہ بیٹھا۔ اس نے پنجاب میں جا کر مختلف قبائل سے میل ملاپ کیا اور اپنی ایک اچھی خاصی جمعیت بنا لی۔ پھر اس نے اس فوج کے ساتھ مگدھ پر چڑھائی کی اور چانکیہ اور دوسرے امرائے دربار سے سازباز کر کے مگدھ کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح نند نہم اور نند خاندان کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ لوگوں نے سکھ چین کا سانس لیا کہ نندوں سے جان چھوٹی۔ وہ نندوں سے بڑے تنگ اور بیزار تھے۔ اس چندر گپت مور (انگریزی مخفف: سی جی مور) اور دوسرے موروں کے زریں دورِ حکومت کے ذکر سے پہلے ہم تم کو یونانی سیّاح سکندر (اسے زار روس سکندر، سکندر خاں لودھی، سر سکندر حیات خاں اور دوسرے سکندروں سے کنفیوز نہ کیا جائے جو بہت بعد میں آئے) کے بارے میں بتاتے ہیں، جو نند نہم کے منحوس عہد حکومت میں پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان کی سیر کی خاطر آیا تھا۔ اس سکندر کو اینگزینڈر آف میکیڈون بھی کہتے ہیں۔ بعد میں روسی لوگوں نے اسے اعظم قرار دیا، اور وہ دنیا کی تاریخ میں پہلا اعظم ہوا۔ بعد میں ہر کسی نے اعظم بننے کی کوشش کی اور اتنے لوگ اعظم ہو گئے کہ تم ان کو گن نہیں سکتے۔

باب نہم

سکندر اعظم --- ایک عمدہ سیّاح

ایک صبح اپر پنجاب کا راجا پرُا پورس ہاتھی (ایک چھوٹا پورس ہاتھی زیریں پنجاب میں بھی راجا تھا جس کا بعد میں ذکر آئے گا) اپنے رتھ میں دریائے جہلم کے کنارے بغرضِ شکار خراماں خراماں جاتا تھا کہ اس نے دوسرے کنارے پر بھیڑ کی کھال کے فضول سے لباس میں ایک پورے قد کے گھنگھریالے بالوں والے خوش شکل نوجوان کو دریا میں کچھ عجیب رسومات ادا کرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ تین چار اور لوگ بھی تھے، اور دو لمبی داڑھیوں والے شخص جو

کابی لگتے تھے۔ بڑے پورس ہاتھی کو شکیل و جمیل نوجوان اچھے لگتے تھے اور اس کا دل اسے "بیلو" کہنے کو چاہا۔ مگر پھر اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ یہ وہی سرپھرا اور لاابالی لڑکا سکندر ہو گا جو چھ سات ہزار مسلّح اور تربیت یافتہ یونانی پیدل اور سوار فوج کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ اور آخری اطلاعات آنے تک ٹیکسلا میں اس نامعقول راجا امبھی کے ساتھ شغلِ میںنوشی کر رہا تھا۔ سکندر کے ارادے کو بھانپتے ہوئے (سکندر ایک پتلی صراحی میں سے دریا میں شراب انڈیل کر اپنے یونانی دیوتاؤں اپالو، آمی را وغیرہ کو راضی کر رہا تھا کہ وہ آنے والی جنگ میں یونانیوں کو ظفریاب کریں) اس نے اپنے ہاتھی سے رتھ موڑنے اور اسے تیز از تیز وزیر آباد کی جانب دوڑانے کے لیے کہا (یہ بڑے پورس ہاتھی کا پایۂ تخت تھا)۔ ہم مصنفین کی رائے میں اس نے عجلت سے کام لیا۔ اگر وہ سکندر سے ایک بار مل لیتا اور بغل گیر ہو جاتا تو وہ عمر بھر کے لیے ایک دوسرے کے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست ہی جاتے (جیسا کہ وہ جنگ کے بعد ہو گئے)۔ اس طرح وہ فضول سی جنگ جس میں ہاتھیوں نے اہلِ پنجاب کو خواہ مخواہ بدنام کیا اور کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا، کبھی نہ لڑی جاتی۔ (بڑا پورس ہاتھی خود ہاتھی نہیں تھا، مگر دیوہیکل اور لحیم شحیم ہونے کی وجہ سے اسے ہاتھی کہتے تھے)۔

پورس ہاتھی نے دارالسلطنت پہنچتے ہی زور شور سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اور ایک دو روز میں اپنے چالیس ہزار پیدل اور سوار سپاہیوں، کئی سو جنگی رتھوں اور بےشمار ہاتھیوں کے لشکر کو لے کر دریائے جہلم کے کنارے جم گیا۔ اس کے ہاتھیوں نے ہراول میں صف بندی کی۔ ان کے مہاوت انھیں ہر وقت اپنے انکسوں سے چنگھاڑنے پر مجبور کرتے رہتے تھے، جس میں ہاتھیوں نے یقیناً کوئی کسر نہیں کی۔ وہ دل کھول کر چنگھاڑے۔ اس سے پورس ہاتھی کا آئیڈیا غالباً یہ تھا کہ یونانی ان ہیبت ناک حیوانوں کی چنگھاڑ سے دہشت زدہ ہو کر حملے کا ارادہ ترک کر دیں گے اور ٹیکسلا واپس چلے جائیں گے۔ جیٹھ اساڑھ کا مہینہ تھا اور جہلم دریا خوب چڑھا ہوا تھا۔ کچھ دن تو دونوں فوجیں اپنے اپنے کنارے سے ایک دوسرے کو کھڑی دیکھتی رہیں، پھر ایک طوفانی رات کو سکندر اپنے سترہ ہزار سوار فوج کے ڈویژن کو پورس ہاتھی کے لشکر سے سولہ کوس آگے لے گیا، اور رات کی سیاہی میں یونانی کشتیوں کے ذریعے دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر اتر گئے (اپنے گھوڑوں سمیت)۔ پورس ہاتھی کو اس بات کا علم کہیں جا کر صبح کو ہوا۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کی سرکردگی میں فوج کا ایک دستہ یونانیوں کی مزاحمت کرنے کے لیے بھیجا، مگر اب لڑائی کا پانسا پلٹ چکا تھا۔ پنجابی دستے کے سپاہی بےجگری سے لڑے اور ان میں سے ایک ایک کٹ مرا۔ پورس ہاتھی کا بیٹا بھی مارا گیا۔ دستے کا صفایا کرنے کے بعد یونانی فوج پنجابیوں پر ٹوٹ پڑی اور حشر کا سامان ہو گیا۔ اسی دوران یونانی لشکر کے دوسرے ڈویژن دریا پار کر کے اترنے لگے۔ گھمسان کا رن پڑا، اور تھوڑی دیر کے بعد ہی پورس ہاتھی کی فوج تتر بتر ہونے لگی۔ ہاتھیوں کے بریکیڈ نے یونانیوں کے تیروں سے بوکھلا کر خود اپنی ہی فوج کی صفوں کو روندنے کا کارنامہ سرانجام دیا، اور یونانیوں کی پوری پوری مدد کی۔ ہزاروں کھیت رہے۔ قلب میں پورس ہاتھی آخری دم تک بہادری سے لڑتا رہا، گو وہ جانتا تھا کہ وہ جنگ ہار چکا ہے۔ ایک دفعہ سکندر نے جنگ کے دوران اپنے دوست

Scanned with CamScanner

راجا آمبھی کے ہاتھ پورس کو پیغام بھیجا کہ وہ ہتھیار ڈال دے تو اس کے حق میں مفید ہو گا۔ پورس ہاتھی نہیں مانا اور الٹا راجا آمبھی کی، جو اپنی غداری کی وجہ سے اسے زہر لگتا تھا، ایسی تیسی کر دی۔ ایک بھالا مارا جو اس کو نہیں لگا۔ پورس ہاتھی کو کئی کاری زخم لگے۔ آخر اسے پکڑ دھکڑ کر سکندر کے روبرو لے آئے۔ سکندر نے راجا امبھی کی وساطت سے، جو تھوڑی بہت یونانی زبان سمجھنے لگا تھا، پورس ہاتھی سے پوچھا کہ اب بتاؤ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پورس ہاتھی نے تن کر بڑی دلیری سے جواب دیا، سکندر! وہی جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ سکندر کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔

پورس ہاتھی کی شکست کے اسباب

ہم مصنفین نے کبھی خود کوئی جنگ نہیں لڑی اور ہمارا شمار ملک کے فوجی ماہرین میں نہیں ہوتا، گو ہم نے بہت سال پہلے دوسری جنگِ عظیم میں بطور ایس سی کلرک بھرتی ہو کر کئی ایک کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اس لیے ہم نے اپنے ایک پرانے دوست ریٹائرڈ حوالدار میجر مولاداد سے (جنھوں نے دوسری جنگ عظیم کے شروع میں برما اور سنگاپور کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف کئی معرکے سر کیے) درخواست کی کہ وہ یونانیوں اور پنجابیوں کے درمیان اس جنگ میں پنجابیوں کی شکست کے اسباب پر روشنی ڈالیں، حالانکہ پنجابی تعداد میں یونانیوں سے کہیں زیادہ تھے۔ ریٹائرڈ حوالدار میجر مولاداد نے مناسب سوچ بچار کے بعد مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

۱ - جنگ اگر دریائے جہلم کے کنارے کے بجائے کسی اور دریا کے کنارے ہوتی تو پورس جیت جاتا۔

۲ - پورس کو چاہیے تھا کہ سکندر کی فوج کو جہلم پار نہ کرنے دیتا۔ فوجی لحاظ سے یہ بڑی سخت غلطی تھی۔

۳ - پنجابیوں کو چاہیے تھا کہ خود جہلم پار کر کے دوسرے کنارے پر اترتے اور یونانیوں کی پشت پر حملہ کرتے۔ پشت پر حملہ کرنا کارگر ہوتا ہے۔

۴ - یونانی سوار فوج کے گھوڑے پنجابی گھوڑوں سے زیادہ موٹے تازے اور تندرست تھے۔ پنجابی گھوڑے نسبتاً پست قد اور مریل تھے۔

۵ - یونانیوں کے نیزے تین گز کے تھے اور پنجابیوں کے دو گز کے۔ نیز پنجابی تیر اندازوں کی بھاری کمانوں پر چلّا چڑھانے کے لیے انھیں گیلی زمین پر رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس یونانی آسانی سے چلّا چڑھا کر تیر مارتے پھرتے تھے۔ پنجابی نیزوں اور تیروں کی نوکیں عدم استعمال کی وجہ سے کند ہو چکی تھیں۔

۶ - ہاتھیوں کے بریکیڈ کا استعمال پورس کی فاش غلطی تھی۔ ہاتھی بزدل جانور ہیں اور فیل خانوں میں سونڈ ہلانے اور چنگھاڑنے کے سوا کوئی اور مفید کام نہیں کر سکتے۔ قدوقامت سے کیا ہوتا ہے۔

۷ - بھاری بھرکم جنگی رتھوں کا استعمال، جن کے پہیے اکثر دریا کے کنارے دلدلی زمین

میں دھنس جاتے تھے۔

۸ - وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے ریٹائرڈ حوالدار میجر مولاداد سے مزید پوچھا کہ پورس کے بجائے اگر وہ خود ہوتا تو شکست سے بچنے کے لیے کیا تدبیر کرتا۔ مولاداد نے حقے کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا کہ وہ سکندر کو صلح کا پیغام بھجواتا اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا۔ ہر عقلمند آدمی کو لڑائی جھگڑے سے احتراز کرنا چاہیے۔ ہم نے حوالدار میجر مولاداد سے اتفاق کیا۔

بیوسی فالس --- ایک آئیڈیل گھوڑے

اس پنجاب یونانی جنگ میں سکندر کو اپنے بیس بائیس سال پرانے رفیق بیوسی فالس گھوڑے کا داغ اٹھانا پڑا۔ اسے اس کے انتقال کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے دو دن تک اپنا کھانا نہیں چکھا۔ کہتے ہیں کہ بیوسی فالس کو پیٹ میں تیر لگا اور وہ زخمی ہوئے پھر لڑکھڑا کر ڈھیر ہوگئے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کو تیر ویر کوئی نہیں لگا، پہلے ہی سے پیرانہ سالی اور ضعیف العمری سے لبِ گور پہنچ چکے تھے، اور اس کی وفات کسی بھی وقت متوقع تھی۔ جنگ کا ایک بہانہ بن گیا اور شہادت نصیب ہوئی۔ یکلخت لڑائی کے دوران سوار (یعنی سکندر) سمیت بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ سکندر اس کی حالت کو جانتے بوجھتے بھی، کہ اب سواری کے قابل نہیں رہے تھے، ہمیشہ اس پر سواری کرتا اور حتی الامکان کسی دوسرے گھوڑے پر نہ بیٹھتا تھا۔ اگر وہ کسی اور گھوڑے چڑھتا بھی تو بیوسی فالس برا مانتے اور آزردہ ہوتے (اور سکندر کی طرف غمگیں اور شکایت آمیز نظروں سے دیکھتے)۔ بیوسی فالس اپنی اس کہن سالی میں بھی سکندر کے سوا کسی اور کو اپنے اوپر سواری نہ کرنے دیتے۔ ایک دفعہ راجا آمبھی کو اس پر سواری کا شوق ہوا۔ آپ نے اسے سوار تو ہونے دیا مگر پھر اس طور اچھلے کہ امبھی نیچے آ رہا۔ گو گردن بچ گئی، مگر دو ہفتے تک لنگڑا لنگڑا کر چلا۔

بیوسی فالس نہایت شہ زور، سرکش اور حیلہ باز گھوڑے تھے (جوانی میں)۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ کسی قدر سنجیدہ، مدبّر اور آرام طلب تو ضرور ہو گئے مگر خصلت نہیں بدلی۔ (بہت کم گھوڑے اپنی خصلت بدلتے ہیں۔) فطرتی اور موروثی کمینگی ویسے کی ویسی رہی۔

ابھی بچھیرے ہی تھے اور عنفوانِ شباب میں قدم دھرنے کو تھے کہ ایک ایرانی، گھوڑوں کا سوداگر، اس کو سکندر کے باپ فلپ کے پاس بیچنے کی غرض سے لایا۔ کئی چابک دست سواروں نے انھیں راہ پر لانے اور اس کی پشت پر بیٹھنے کی کوششیں کیں، مگر یہ کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے اور فوراً بدک کر الف ہوجاتے اور کدکڑے لگانے لگتے۔ پندرہ سالہ شہزادہ سکندر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس کی لگام پکڑ کر اس کا منہ سورج کی طرف کر دیا، تاکہ وہ اپنے سائے سے نہ بھڑکیں (دراصل بیوسی فالس اپنے سائے سے ڈر رہے تھے)۔ ویسے سکندر نے یہ اس لیے بھی کیا ہو گا تاکہ آپ کی آنکھیں چندھیا جائیں اور آپ کچھ کچھ اندھے ہو جائیں۔ سکندر نے آپ کو پچکارا، آپ کی گردن پر تھپکی دی اور، آپ ابھی آنکھیں ہی جھپک رہے تھے کہ، اچھل کر آپ کی پشت پر سوار ہو گیا (ہم اسے فئیر خیال نہیں کرتے)۔ بیوسی

Scanned with CamScanner

فالس ایسے قابو ہوے کہ پھر شوخی نہ سوجھی۔ سکندر کا باپ فلپ می چلے بیٹے کی دلاوری دیکھ کر بول اٹھا، "اے میرے بیٹے! جا اور اپنے لیے ایک ایسی سلطنت تلاش کر جو تیرے شایانِ شان ہو۔ یہ مقدونیہ کی ریاست تیرے لیے بہت چھوٹی ہے"۔ باپ کے منہ سے نکلی بات سچ ثابت ہوئی اور بیس بائیس برس کی عمر میں سکندر نے مغرور ایران کو پامال کر کے مشرق میں اپنی ایمپائر بنا لی۔

خریدے جانے سے پہلے آپ کا نام بیوسی فالس نہیں تھا، آپ کچھ اور کہلاتے تھے۔ سکندر نے آپ کا نام بیوسی فالس رکھا، یعنی بختاور (ویسے ہم یونانی زبان سے نابلد ہیں)۔

سکندر نے اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے اپنی فوجی چھاؤنی کے موقع پر ایک نئے شہر بیوسی فالس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ بیوسی فالس کی تجہیز و تکفین بھی فوجی اعزاز کے ساتھ اسی شہر میں ہوئی، اور تیس سو کہنی سال سپاہیوں کی رجمنٹ نے ان کو سلامی دی (زمانے کی ناقدری پر حیف ہے کہ اب ان کے مزار کا پتا نہیں)۔ بیوسی فالس اب جہلم شہر کہلاتا ہے۔ شاید اہلِ پنجاب کو اصل نام پسند نہیں آیا یا ان کی زبان پر نہیں چڑھا حالانکہ بالکل آسان اور معقول ہے۔

مصنفین کا نوٹ: ہماری تجویز ہے کہ سکندر کے اہلِ پنجاب پر احسانات (اور اس کے الٹ) کے پیشِ نظر جہلم کا نام پھر سے بیوسی فالس رکھا جائے۔ نامی گرامی گھوڑے بیوسی فالس کے مزار کا پتا لگانا بھی ضروری ہے تاکہ عوام النّاس وہاں حاضری دے کر فیض حاصل کر سکیں۔

باب یازدہم

انکل پورس ہاتھی اور دو بھتیجے

سکندر نے کچھ عرصے اپنی فوجوں کو آرام دینے کی خاطر بڑے پورس ہاتھی کے پایۂ تخت وزیرآباد میں قیام کیا۔ وہ خود اپنے شاہی خیمے میں ٹھہرنے کے بجائے پورس ہاتھی کا مہمان ہی کر رہا، جہاں اس نے یونانی اطبّا سے اپنے چھ فٹ پانچ انچ کے قوی ہیکل مہمان کے جنگ میں آئے ہوے زخموں کا علاج کرایا جو جلد ہی انگور بھر لائے مگر پورس ہاتھی اپنے دو جوان بَلوان بیٹوں کی موت کے صدمے سے کچھ نڈھال اور ملول سا تھا (گو اس کے پچاس کے لگ بھگ بیٹے اور بھی تھے مگر یہ دو اسپیشل تھے)۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی اس عرصے میں محل میں سکندر کی اردل میں رہا (گو پورس ہاتھی نے اسے مہمان ہونے کی دعوت نہیں دی تھی)۔ وہ ٹیکسلا کا ذکر شاذونادر ہی کرتا جیسے اسے اپنی مملکت سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔ دراصل امبھی کو نوجوان یونانی شہزادے سے محبت ہو گئی تھی اور ایک دوسرے کی صحبت میں ان کا جی خوب لگتا۔ ایک تو وہ دونوں ہم عمر اور ہم مذاق تھے، دوسرے ہم پیالہ وہ ہم نوالہ۔ راتوں کو ان کی محفلیں دیر تک گرم رہتیں کیوں کہ سکندر مَے کا متوالا تھا، اور امبھی اس سے بھی زیادہ۔ پنجابیوں میں صرف امبھی ہی کو تھوڑی بہت یونانی آتی تھی۔ وہ پہروں یونانی ادب، فلسفے، مائیتھالوجی اور فنِ حرب پر سکندر کی طولانی اور دلچسپ باتیں سنا کرتا (سکندر کافی باتونی تھا، اسے ہومر کے کئی حصے ازبر تھے)۔ امبھی کو سکندر کی باتیں کچھ کچھ ہی سمجھ

میں آتیں مگر وہ اسے اچھی لگتیں۔ وہ اکثر ایک ہی کمرے میں سوتے اور بعض یونانی جرنیل جو محل میں سکندر سے ملنے آتے، دونوں کو ہمیشہ اکٹھا دیکھ کر حیران ہوتے اور ایک دوسرے کو آنکھ مارتے۔ بعد میں جب بڑا پورس باتھی بھلاچنگا ہو گیا تو وہ بھی ان محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ پینے کے معاملے میں سکندر اور راجا امبھی کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی، اور وہ دونوں کو فرش پر اوندھا چھوڑ کر غیرمتزلزل قدموں سے اپنے حرم کو جاتا۔ یہ نہیں کہ شراب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، دو تین پیالے انڈیلنے کے بعد پورس باتھی کافی بےلحاظ اور بدتمیز ہو جاتا اور سکندر اور امبھی سے نہ چھاپی جا سکنے والی باتیں کرتا (حالانکہ بنیادی طور پر پورس باتھی ایک نہایت اچھا، شائستہ مزاج اور روشن ضمیر شخص تھا)۔ راجا امبھی کی تو وہ پنجابی زبان میں خوب خبر لیتا (جو سکندر نہ سمجھ سکتا)۔ کئی بار اس نے امبھی سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے اور ٹیکسلا کو اپنی ماں کے یاروں کے حوالے کر کے دوسروں کی صیاقتیں اڑانے اور ان کی مفت کی شرابیں پینے پر اسے شرم نہیں آتی؟ امبھی اس ادھیڑعمر دیو کی گالیاں سن کر مسکرا دیتا (امبھی بھی بنیادی طور پر دل کا برا نہ تھا)، مگر ایک دفعہ امبھی کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے پورس باتھی کو جنگ میں شکست کا طعنہ دیا۔ اس پر پورس باتھی نے سکندر، یونانی فوج اور بالعموم یونانیوں کے بارے میں ایسے کلمات کہے جو چھاپے نہیں جا سکتے اور اٹھ کر امبھی کی ٹھکائی کرنے کو ہوا۔ سکندر نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرایا (ایک دو ہتڑ اسے بھی لگے) ورنہ امبھی کی جان کی خیر نہیں تھی۔ ویسے سکندر کہیں سال دیو کی قدر کرتا تھا اور اس کی صاف گوئی کو مائنڈ نہ کرتا تھا۔ دونوں، سکندر اور امبھی، توجہ اور اشتیاق سے پورس باتھی کے دانشمندانہ مشورے سنتے (اسے نصیحت کرنے کا کافی شوق تھا) اور اسے شفقت سے چاچاجی کہتے۔ ایک رات سکندر نے نشے کے ترنگ میں شیخی بگھاری کہ اس کی ماں اولمپیا نے اسے بتایا تھا کہ وہ فلپ کا بیٹا نہیں اور اس کا اصل باپ دیوتا زیوس ہے، اس لیے وہ فانی انسان نہیں بلکہ خود دیوتا ہے۔ پورس باتھی نے دیوتا بھتیجے کا خوب مذاق اڑایا اور اسے ڈانٹا، "نوجوان! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟ کبھی دیوتا بھی انسانوں کے ساتھ وِواہ کرتے ہیں؟ پاگل تو میں تجھے پہلے ہی سمجھتا تھا مگر اتنا نہیں جتنا تو اب ہوا ہے۔ اپنے گھر جا اور کسی قابل وید سے اپنا علاج کرا!"

اس عرصے میں یونانی فوجی پنجابیوں سے خوب گھل مل کر پنجابی نسل کو بہتر بنانے کے جتن کر رہے تھے (جو پہلے ہی ہُنوں، ایرانیوں اور افغانوں کے حملوں کے نتیجے میں کافی بہتر ہو چکی تھی)۔ سکندر کے کڑے فرمان کے باوجود، کہ فوجی پنجابی عورتوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور نیک چال چلی کا ثبوت دیں، بہت سے یونانی فوجیوں نے چپکے چپکے پنجابی عورتوں سے شادیاں کر لیں اور گھر داماد ہی کر بیٹھ رہے (وہ بعض جرنیلوں اور افسروں کی چشم پوشی سے کیمپ سے کئی کئی دن غیرحاضر رہتے تھے)۔ کئی ایک پنجابیوں نے آ کر دہائیاں دیں کہ ان کی بیویاں ان سے برگشتہ ہو کر یونانی سپاہیوں کو گھر میں لے آئی ہیں۔ بڑے پورس باتھی نے (جو نسل کو مزید بہتر بنانا چاہتا تھا) ان شکایات کا زیادہ نوٹس نہیں لیا، مگر سکندر کو جب اپنے سپاہیوں کی بےراہ روی کی خبریں ملیں تو وہ بہت لال پیلا ہوا۔ اس نے اپنے

Scanned with CamScanner

جرنیلوں کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ سکندر نے خود اپنی سیاحت کے دوران دو تین بادشاہوں اور سرداروں کی بیٹیوں سے شادیاں کی تھیں مگر وہ مصلحت ملکی کی بنا پر تھیں؛ بالعموم وہ عورتوں سے دور دور رہتا تھا اور ان کے متعلق اس کی رائے کوئی خاص اچھی نہ تھی۔

باب دو از دہم

لوٹر پنجاب کی سیاحت

اب سکندر کی فوج نے ضرورت سے زیادہ آرام کر لیا تھا، چنانچہ اس نے بقیہ پنجاب (یعنی لوٹر پنجاب) کی سیاحت کا قصد کیا۔ اسے انکل پورس سے جدائی گوارا نہ تھی مگر اس نے اسے تسلّی دی کہ وہ سیاحت کے بعد پھر لوٹ کر وزیرآباد آئے گا اور وطن واپسی سے پہلے چند ماہ اس کے پاس قیام کرے گا۔ بڑے پورس ہاتھی نے سیاحت کے اس آئیڈیا کو سراہا۔ چار پانچ ماہ کی مہمان نوازی کے بعد وہ کچھ سکون اور آرام کا طالب تھا۔ روز روز کی بلانوشی سے اس کی صحت بگڑ چکی تھی اور وہ فربہ اور صفراوی مزاج ہو رہا تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ سکندر کے جانے کے بعد راجا امبھی کے اس کے پاس ٹکے رہنے کی کوئی وجہ نہیں رہے گی اور وہ ٹیکسلا چلا جائے گا ... مگر راجا امبھی ٹیکسلا نہیں گیا؛ جب سکندر کی فوج نے کوچ کیا تو امبھی بھی ہتھیار سجائے گھوڑے پر سوار سکندر سے چار قدم پیچھے تھا۔ (امبھی بھی اب خود کو یونانی جرنیلوں میں سے ایک گمان کرنے لگا تھا، اور سکندر ہی کی سی چال ڈھال، وضع قطع اختیار کر لی تھی۔) یونانی لشکر میں ہر کوئی اس آپ سٹارٹ غیرملکی بہروپیے سے نفرت کرتا تھا، لیکن امبھی کی بلا سے۔

سکندر دریائے چناب پار کرکے ایک اور راجا پورس کے علاقے میں داخل ہوا جو چھوٹا پورس ہاتھی کہلاتا تھا۔ چھوٹا پورس ہاتھی بزدل نکلا اور یونانی فوج کا مقابلہ کیے بغیر بھاگ گیا۔ سکندر کو راجا کی یہ حرکت پسند نہ آئی، اور اپنی پشت کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے ایک قابلِ قدر جرنیل کی کمان میں ایک ڈویژن راج دھانی میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے راوی کو پار کیا۔ یہاں سانگلا کے کھٹّی اس کے خیرمقدم کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے ڈٹ کر یونانیوں کا مقابلہ کیا اور ان کے دانت کھٹّے کر دیے۔ دونوں فوجیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا اور ہزاروں کھٹّی کھیت رہے۔ یونانیوں نے سانگلا شہر کو لوٹ مار کے پھکڑ بنا دیا۔ وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے تھے مگر راجا امبھی نے صلاح دی کہ اس میں بہت وقت ضائع ہو جائے گا۔ وزیرآباد سے کوچ کے وقت راجا امبھی کا خیال تھا کہ سکندر کی لوٹر پنجاب کی سیاحت ایک پکنک ہو گی۔ اسے سانگلا والوں کے ارادوں کا پتا ہوتا تو سکندر کے ساتھ چلنے کے بجائے گھوڑے کی باگ ٹیکسلا کی جانب موڑ لیتا۔ کھٹّیوں پر سکندر کی خونریز فتح نے اردگرد کے راجوں اور قبائل کے سرداروں میں ایسی دہشت پھیلائی کہ انھوں نے اس کی اطاعت کر لینے میں مصلحت سمجھی۔ ویسے یہ کھٹّی زبردست قوم تھے اور ایک یونانی مورخ اسٹرابو کے مطابق اپنی خوبصورتی، بہادری اور فنِ سپہ گری کی مہارت میں سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ وہ نازیوں کی طرح صرف خوبصورت اور صحت مند بچوں ہی کو بڑھ کر جوان

ہونے کی اجازت دیتے۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی بنا رکھی تھی جو ہر دو ماہ قبل پیدا ہونے والے بچے کا معائنہ کر کے فیصلہ کرتی کہ آیا وہ خوبصورتی اور جسمانی تندرستی میں اس معیار پر پورا اترتا ہے جو قانون نے مقرر کر رکھا ہے، اور اسے زندہ رہنے دیا جائے یا نہیں۔ جو بچّے مجوّزہ قانون کے مطابق "درست" نہیں ہوتے تھے انھیں وہیں ختم کر دیا جاتا تھا۔

ان اطاعت کرنے والے راجاؤں میں ایک عجیب و غریب راجا سوبھوتی تھا جس نے سکندر کی شاہانہ طور پر آؤبھگت کی۔ سوبھوتی کتّوں کا بڑا شوقین تھا، اور مختلف نسلوں اور قومیتوں کے کتّے -- السیشی، کاکر اسپینل، ایرانی، گدّی، گلہری کتّے -- اس کے پاس موجود تھے۔ راجا کے محل کا بیشتر حصہ ان کتوں کے تصرّف میں تھا، اور ان کے لیے کھانا باقاعدہ دسترخوان پر چنا جاتا۔ یونانی اس راجا سے بڑے متاثر ہوئے۔ ایک گدّی کتّے نے ایک دن راجا امبھی کو کاٹ لیا جس کے کچھ دن بعد وہ مر گیا (یعنی گدّی کتا)۔ سوبھوتی کو قدرتاً امبھی کے بجائے اپنے گدّی کتے کے مرنے کا بڑا رنج ہوا۔ سوبھوتی نے سکندر کی اس کی مملکت میں آمد کی یادگار کے طور پر ٹکسال میں سونے کے سکّے ڈھلوائے جن پر سوبھوتی اور سکندر دونوں کی آبھرواں صورتیں تھیں۔ سکندر سکّے پر اپنے آپ کو پہچان نہ سکا (بلکہ سوبھوتی زیادہ سکندر لگتا تھا) بہرحال وہ خوش ہوا اور سوبھوتی کے بوسہ لیا (سوبھوتی بھی کافی شکیل و جمیل تھا)۔

سکندر اب مارچ کرتا ہوا بیاس کے کنارے پہنچا، جہاں اس نے مگدھ کی وسیع سلطنت کی دولت اور حشمت کے بارے میں سنا جو چند منزلوں پر وادیٔ گنگا کے دامن میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں چندر گپت موریا (یا سی جی مور) اسے ملا اور اسے مگدھ پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ (سی جی مور یونانیوں کی مدد سے نندنہم کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔) کسی وجہ سے سکندر کو اس شیخی خور نوجوان کی نمک حرامی اور تملّقانہ انداز نہ بھایا (گو راجا امبھی نے اس کی سفارش کی) اور سکندر چڑ گیا۔ اس نے مور کو اپنی نظروں سے دور ہو جانے اور ہوا کھانے کا حکم دیا۔

"اور میں جانتا ہوں تمھارے دل میں کیا ہے"، سکندر نے کہا۔ "تم جاسوس ہو! یہاں سے تو دو گیارہ ہو جاؤ، اور اگر پھر تم نے میرے کیمپ میں شکل دکھائی تو میں تمھیں گھوڑے کی دُم سے بندھوا دوں گا"۔ راجا امبھی نے جب اس کا ترجمہ مور کو سنایا تو مور بھونچکا رہ گیا۔ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ "چارمر" ہے اور سریلی بین سے زہریلے ناگ بلوں سے نکال سکتا ہے۔ سی جی کو گھوڑے کی دُم سے باندھے جانے کی تجویز نہ بھائی اور وہ فوراً وہاں سے چمپت ہو گیا۔

باب سیز دہم

سکندر سیّاح کی وطن کو واپسی

سکندر مگدھ کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر جنگ سے تھکے ہارے مقدونیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ انھیں گھر سے نکلے آٹھ طویل برس ہو چکے تھے، اور وطن سے ہزاروں میل دور، اجنبی دیسوں میں معرکہ آرائیوں اور فتوحات سے انھیں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ سکندر نے جس کا جی ابھی اپنی سیاحتوں سے نہیں بھرا تھا، اور جو دنیا کی انتہا دیکھنا چاہتا تھا، انھیں

Scanned with CamScanner

اپنی خوش کلامی سے منانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانے۔ سکندر ایک غمگین دل سے واپس پلٹا اور یونانی اسی راستے سے ہوتے ہوئے، جس پر وہ آئے تھے، واپس چلے۔ دو تین دن وہ کتّوں والے راجا سوبھوتی کی راج دھانی میں رکے، جو ان کو اتنی جلدی واپس دیکھ کر حیران ہوا۔ یہاں پھر ایک چتکبرے کتے نے راجا امبھی کو کاٹ لیا (کتے کسی وجہ سے اسے پسند نہیں کرتے تھے)، اور مر گیا (یعنی چتکبرا کتا)۔

پھر وہ چھوٹے پورس ہاتھی کے علاقے میں سے گزرے جہاں پیچھے رکا ہوا گیریزن مکھیاں مار رہا تھا۔ چھوٹا پورس ہاتھی ابھی تک بھاگا ہوا تھا اور اس کا کوئی اتاپتا نہ تھا۔ جہلم پہنچنے پر بڑے پورس ہاتھی نے یونانیوں کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ چچا اور بھتیجے گلے ملے۔ اب سکندر نے وطن واپسی کی بڑے پیمانے پر زورشور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ مشرقی سمندر دیکھنے پر تُلا ہوا تھا (گو پورس نے اسے سمجھایا کہ بھتیجے اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا، سیدھے راستے سے گھر لوٹو)، اور اس نے دو ہزار چھوٹے بڑے جہازوں اور کشتیوں کے بیڑے کی تیاری کا حکم دیا۔ اس کے انجینئر، جہاز سازی کے ماہر اور ہندوستان کے آدھے بڑھئی، لوہار، ٹھٹھیرے اس کام میں جُت گئے۔ اپر پنجاب کی کل آبادی بھی سب دوسرے کام چھوڑ چھاڑ کر یونانیوں کی نگرانی میں کشتی سازی میں مصروف ہو گئی۔

سکندر اس بار پورس کے محل میں نہیں ٹھہرا، اور موقعے پر ہر چھوٹے بڑے کام کی خود دیکھ بھال کرتا تھا۔ راجا امبھی نے اپنے دوست کو اس تن دہی سے مصروفِ عمل دیکھ کر اپنی مملکت ٹیکسلا اور اپنی بیویوں کی خیرخبر لینے کا وقت نکالا۔ اس کی مملکت محفوظ اور قائم تھی اور بیویوں میں سے بھی کوئی نہیں بھاگی تھی۔ ٹیکسلا چند ہی دن توقف کر کے (جہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا) وہ جلد ہی اپنے دوست کے پاس لوٹ آیا، مگر وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ پورس نے اسے اپنے محل میں ٹھہرانے سے انکار کر دیا (اس کی بیویوں اور خادموں نے اعتراض کیا تھا)، اور سکندر کے پاس اپنی تیاریوں میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ راجا امبھی فطرتاً یارباش اور موج میلے کا شوقین ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا جو ہر وقت کسی کام میں مصروف رہتے ہیں، اور کام کے دوران دوستوں کو پہچاننے سے منکر ہو جاتے ہیں۔

بیڑا تیار ہونے میں پانچ مہینے لگ گئے۔ اس دوران سکندر نے جہلم کے کنارے پتھروں اور چونے سے بارہ مذبح تیار کرائے جن پر یونانی دیوتاؤں کے حضور بیلوں، بھیڑ، چھتروں اور داڑھی والے بکروں کی قربانیاں گذرانیں اور بخور جلایا۔ یہ مذبح اس نے بقول اس کے ان کشتوں کے یادگار کے طور پر قائم کیے جو اس نے اور یونانی فوج نے ان آٹھ سالوں میں اٹھائے تھے اور جن سے وہ اب تک سلامتی سے عہدہ برآ ہوتے آئے تھے۔ دیوتاؤں کے قربانی کے اخراجات اس کے منہ بولے چچا بڑے پورس ہاتھی نے اپنے جیب خرچ سے مہیّا کیے، اگرچہ سکندر ان کی لاگت خود ادا کرنا چاہتا تھا۔ آخرکار بیڑا تیار ہو گیا اور یونانی فوج کا بڑا حصہ اپنے گھوڑوں اور سازوسامان اور رسد کے بوروں سمیت سوار ہو گیا۔ یونانی لشکر کے دو سوار اور پیدل ڈویژنوں کو دو جرنیلوں کی سرکردگی میں دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ مارچ کرنے کا حکم دیا گیا۔

روانگی سے پہلے سکندر نے اپنے جدامجد ہرکولیس، مصری دیوتا آمی راہ اور دوسرے یونانی دیوتاؤں کو دریا میں شراب کی دھاریں چڑھائیں۔ بڑے پورس ہاتھی اور اپنے چکری دوست راجا امبھی کو الوداع کہی۔ (دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سکندر خود بھی رو رہا تھا)۔ وہ اپنے شاہی جہاز میں بیٹھا اور بیڑا حرکت میں آیا۔ اربار جہلم کے دونوں کناروں پر پنجاب کے البیلے جواں، بچے اور بوڑھے یونانیوں کو وداع کرنے کے لیے پنڈ دادی خاں کے آدھے راستے تک بیڑے کے ساتھ ساتھ گئے۔ کھڑتالیں بجاتے، بھنگڑے ڈالتے، بولیاں بولتے، ڈھول بجاتے، وہ جنگل میں منگل کا سماں پیدا کرتے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے پنجابی جٹیاں اور مٹیاریں تھیں، ڈھولکیں بجاتی اور مایے گاتی۔ ان میں سے چند ایک وہ بھی تھیں جن کے پردیسی محبوب اب اپنے جہازوں میں نامعلوم دیس کو جا رہے تھے۔ ایک پالکی میں راجا امبھی کی سب سے چھوٹی رانی پدماوتی بھی تھی، جو ٹیکسلا سے اس لیے بھاگی بھاگی آئی تھی کہ کہیں اس کا لاابالی شوہر یونانیوں کے ساتھ چلنے کو تیار نہ ہو جائے۔ سکندر اور یونانی اس شاندار رخصتی کو کبھی نہیں بھولے۔

اس لمبے سفر میں یونانیوں کو بڑے مصائب اور کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا: سکندر کہا کرتا کہ وہ خطرات جی کا اس نے مقابلہ کیا، ان سے کسی طرح کم نہ تھے جو جیسن اور آرگونائس کو گولڈن فلیس (سنہری اون) کو ڈھونڈنے کے بحری سفر میں درپیش ہوئے۔ راستے میں دو تین خونریز جنگیں بھی ہوئیں اور ایک دفعہ تو ملی قوم نے سکندر کی جان ہی لے لی تھی اور وہ بال بال بچا تھا۔ لڑتے بھڑتے وہ دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ یہاں اس نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کو امیرالبحر نیرکس کی کمان میں سمندری ساحل کے ساتھ ساتھ خلیج فارس اور ہرمز کی بندرگاہ کو جانے کا حکم دیا۔ بڑے حصے کو جرنیل قراکرونی کی سرکردگی میں درۂ بولان اور قندھار کے راستے اپنے ایرانی پایۂ تخت پرسی پولس کو روانہ کیا۔ خود درۂ بولان سے جنوبی بلوچستان اور ساحلِ مکران کے راستے گھر کو چلا (اس سے مقصد کنارے کے ساتھ ساتھ امیرالبحر نیرکس کے بیڑے کے لیے خوراک اور پانی کے ذخیرے قائم کرنا تھا)۔ ہم مصنفین کی اپنی تحقیق کے مطابق بلوچستان میں بکٹیوں، مریوں، مینگلوں، برنجوؤں، سولنگیوں، ملنگیوں وغیرہ نے اپنی مہمان نوازی کی روایات کو ترک کر کے ان مہمانوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو بالعموم پردیس سے آئے ہوئے مہمانوں سے نہیں کرتے۔ ان کی بروں اور بھیڑوں کی سجّی سے خاطرمدارات کرنے کی بجائے وہ یونانیوں کے خوراک کے ذخیروں پر ہاتھ صاف کرنے سے نہ چوکے۔ بکٹی اور مری بالخصوص چار پانچ سو یونانیوں کو ان کے گھوڑوں سمیت اغوا کر کے لے گئے اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کوئی نہیں جانتا۔ سکندر کو بلوچوں کے اس غیرمسافرنواز رویّے پر بےحد صدمہ ہوا اور اسے پنجاب کے بڑے پورس ہاتھی، راجا امبھی اور راجا سوبھوتی کی خاطریں اور نازبرداریاں بڑی یاد آئیں۔ اس نے دیوتا اپالو اور اپنے جدامجد ہرکولیس کو مذبحوں پر قربانیاں چڑھائیں اور منّت مانی مگر وہ (اپالو اور ہرکولیس) گول کر گئے۔ سکندر اس مارچ کے دوران اپنے بیشتر مال اسباب اور خوراک کے ذخیروں سے ہاتھ دھو بیٹھا اور ایران کی سرزمین پر قدم دھرتے ہی سجدۂ شکر بجا لایا۔ کسی

Scanned with CamScanner

نہ کسی طرح تینوں مہمّیں سلامتی سے ہرمز کی بندرگاہ میں سرانجام ہوئیں۔ امیرالبحر نیرکس کے تحت سمندری راستے سے آنے والی فوج بھی تقریباً صحیح سلامت پہنچی، ماسوا اس کے کہ دو درجن سپاہیوں کو مچھلیوں نے کھا لیا تھا اور تقریباً سب کے سب فاقوں اور اینٹھی ٹانگوں کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ہرمز سے وہ سوسا کے شہر میں پہنچا جہاں اس نے اپنی فتوحات کا ایک زبردست جشن منایا۔ ایک بڑی شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا، جس میں اس نے، سرداران فوج نے اور لشکریوں نے دس ہزار ایرانی خواتین سے شادیاں کیں۔ وہ سپاہی جو شادی کرنے کے خواہش مند نہ تھے ان کی بھی شادی ہو گئی (اس کا پتا انہیں بعد میں چلا جب کچھ نہیں ہو سکتا تھا)۔ اس اجتماعی شادی کے بعد سکندر نے اپنی آفٹر ڈنر تقریر میں کہا کہ یہ شادیاں ایرانی اور یونانی قوموں کو ایک قوم بنانے کی خاطر عمل میں لائی گئی ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایتھنز میں یونانی ریاستوں کی لیگ کو (جس کا وہ منتخب سیکرٹری جنرل تھا) نامہ بھیجا کہ اسے دیوتا قرار دیا جائے اور سردست چار مذبح تعمیر کر کے اس کے حضور سالم حیوانوں کی سوختنی قربانی چڑھائی جائے اور بخور جلایا جائے۔ اس پر لیگ کے ارکان کا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً سکندر کو کچھ ہو چلا تھا۔ مگر لیگ نے اس کا دیوتا ہونا تسلیم کر لیا، اور یہ بھی کہ وہ فلپ کی بجائے زیوس کا بیٹا ہے۔

سکندر اپنے جدامجد ہرکولیس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اور بہت سے کارنامے سرانجام دینا چاہتا تھا کہ وہ بابل کے شہر میں ایک عجیب عارضے میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے یونانی طبیب اس مرض کی تشخیص نہ کر سکے، گو ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ بیماری انسانوں میں نہیں پائی جاتی اور غالباً دیوتاؤں کی بیماری ہے۔ مختلف دوا دارو تجویز کی گئیں، مگر کوئی افاقہ نہ ہوا اور اس کی حالت ردّی ہوتی گئی۔ اس کے جنرل اور امرا اسے کندھوں پر اٹھا کر قدیم شام کے بادشاہ نبوشدنذر مرحوم و مغفور کے محل میں لے گئے جہاں اپنی فوج کی فائنل پاسٹ کے بعد بوقتِ شام اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جدید تحقیق کے مطابق سکندر کی موت ایڈز سے واقع ہوئی تھی، جس کے بارے میں اس زمانے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے مرنے کے چند دن بعد اس کا پنجابی دوست راجا امبھی بھی (جسے سکندر کی موت کی خبر نہیں پہنچی تھی)، اغلباً ایڈز ہی کے عارضے میں، دنیا سے سفر کر گیا۔ دونوں ابھی جواں جہاں تھے۔ بتیس تینتیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ ہائے، صد افسوس،

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے گر پڑے
وہ کیا کرے جو غنچہ بھی کھلا کے گر پڑے

اب ہم تمہیں مکدھ کے سی جی مور اور دوسرے موروں کی طرف لے چلیں گے جو کے انتہائی زریں دور میں مکدھ (یا ہندوستان) دنیا کی ٹاپ قوموں کی صف میں آ گیا۔

نوٹ: ہم مصنفین کو اس امر کا احساس ہے کہ سرسری تاریخ کچھ زیادہ ہی طویل ہوتی

جاتی ہے۔ دراصل اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ پھر بھی ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ غیرضروری تفصیلات سے اجتناب کریں گے اور قابلِ ذکر (اور ناقابلِ ذکر بادشاہوں) کی تعداد کے پیشِ نظر کسی بادشاہ کو ایک آدھ صفحے سے زائد کوریج نہیں دیا جائے گا۔ آخر ہمیں اس سرسری تاریخ کو اختتام تک پہنچانا ہے، اس سے پیشتر کہ یہ ہمیں اختتام تک پہنچا دے۔

(فصلِ سوم جاری ہے۔)

افضال احمد سیّد
کی نظموں کا مجموعہ
دو زبانوں میں سزائے موت
قیمت پچاس روپے

Scanned with CamScanner

علی امام نقوی

میراث

دھک دھک کرتے دل سے اک ذرا نیچے آگ دہک رہی تھی، اور اس کی تپش آنکھوں سے گزر کر آنکھوں کی پُتلیوں تک پہنچنے کے بعد تلاش کی صورت اختیار کر گئی تھی، گھونگھٹ کی اوٹ سے بار بار کنکھیوں سے وہ نئے گھر میں باورچی خانے کو ڈھونڈتی، لیکن اس کی جستجو کے درمیاں ہر بار کوئی چنچل لڑکی یا کوئی معمّر عورت دیوار بن جاتی۔

فضا میں گوبر کی بُو، چکنی مٹی کی بساند، اوسط درجے کے عطر اور اُبٹن کی ملی جُلی مہک رقصاں تھی، کچھ دیر پہلے اس میں ایک خوشبو کا اضافہ اَور ہوا تھا۔ جانی پہچانی خوشبو۔ اس کی نظروں سے اوجھل باورچی خانے میں کسی نےململ کی رَملّیا میں لونگ، الائچی، زیرہ اور دارچینی قید کر کے کھولتے چاولوں میں ڈالی تھی۔ اور جب سے اس نے فضا میں اس کی خوشبو کو ناچتے محسوس کیا تھا، اس کے دل سے نیچے دہکتی ہوئی آگ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھا، شوخ رنگوں میں ملبوس سانولی سلونی لڑکیاں ہوائی چپّلوں کو گھسیٹتی اِدھر اُدھر آنےجانے میں مصروف تھیں، صحن کے درمیاں نیم کے سائے میں ایک زانو موڑے، دوسرا اٹھائے پلکھی بڑی بوڑھیوں سے مبارک باد وصول کر رہی تھی۔ ایک کونے میں تین سائیکل رکشائیں کھڑی تھیں۔ بیاہ میں آئے مہمانوں کے کم سِن بچے ان کے پاس کھیل رہے تھے۔ اور دو چار لڑکیاں اسے اپنے حلقے میں لیے، اس کے ہونٹوں پر پڑے ہوئے تالے کو کھولنے میں مصروف تھیں۔

"ایےجی بھابھی جاں۔ میں کہوں۔ نام ہی بتا دو اپنا۔"

"اری پرے کو ہٹ۔ بڑی آئی نام پوچھنے والی۔ تجھے کیوں بتائیں؟

"دور ہٹو نکوڑیو۔ میں پوچھوں۔ ہاں اب تو بتاؤ، نام کیا ہے گا تمہارا؟"

"اری نصیبی۔ مجھے لگے تیری مَت ماری گئی۔ آج کے دن ایک ہی نام ہووے ہے۔"

rekhta

Scanned with CamScanner

تو جانتی ہے وہ نام؟
"دلھن۔"
"اری جا باؤلی۔"
"کیوں، کیوں؟"
"بہو بھی تو ہووے ہے۔"
"اری ہٹا بھی۔"
"کیوں بھلا؟"
"چست پجاموں والیاں کہویں ہیں بہو، سلوار والیاں کیوں کہیں؟"
"یو تو ٹھیک کہوئے ہے تو۔ پر ایک بات بتا دے۔ یو بیاہ والے روز سلوار کمیض کیوں پنھاویں ہیں دلھن کو، گرارا کیوں نہیں پنھاتے؟"
"تُو بھی لیجیو گرارا، اپنے بیاہ میں۔"
"اب بتا بھی دلھن۔"
کیا بتاؤں؟ اس نے سوچا۔ میں کیا اور گاؤں سے بیاہ کے آئی ہوں؟ اسی گاؤں کی تو ہوں۔ بس کوٹ سے گڑھی میں آگئی۔ یہ۔۔۔۔ یہ جو پٹرپٹر بول رہی ہیں، کل کوٹ میں مجھے سمجھا رہی تھیں۔ کمربند میں دوچار گرہیں لگا لیجیو۔ اور اب انجان بنی نام پوچھ رہی ہیں۔ میں کیوں بتاؤں نام؟۔۔۔ سب جانیں ہیں میرا نام صابرہ ہے۔ گھر والے مجھے صبّو کہویں ہیں۔۔۔ سوچتے سوچتے اس کی نظروں کے پرکار گھومنے لگے۔ اچھا بڑا صحن ہے گا۔ بابا کے گھر سے بھی بڑا۔ دس بارہ پلنگ تو پڑتے ہی ہوں گے۔ پر۔۔۔ موئے قدمچے دور ہیں گے۔ وہاں جانے کے لیے پلنگوں کی کیاریوں سے گزرنا ہو گا۔ یو گاؤں والے عجیب ہیں گے، قدمچے اِتّی دور بناویں ہیں۔ مجھے تو۔۔۔ مجھے تو سرم آوے گی رات بے رات اٹھتے جاتے۔ اف۔۔۔۔۔

آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ اور ان کی تپش آنکھوں کی پُتلیوں نے محسوس کر لی تھی۔ سو ایک بار پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور پاس کوئی کھانا لے کر آتا ہوا نظر نہیں آ رہا ہے۔

دس پندرہ منٹوں بعد پلاؤ کی سینی اس کے سامنے پلنگ پہ رکھی ہوئی تھی۔ میکے سے ساتھ آئی ہوئی چچی نے لونڈیوں بالیوں کو چلتا کیا۔ اس کے ہاتھ دھلوائے، اور رسّی پہ پڑی چادر دائیں بائیں سرکا کر پردہ کیا۔ صابرہ نے جھٹکے سے سرخ جارجٹ کا لچکا لگا دوپٹہ ایک طرف ڈالا۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے سینی کے درمیاں چینی کی پلیٹ میں رکھے پلاؤ کو دیکھا۔ پلاؤ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو ایک لمبے سانس کے ذریعے اپنے جسم میں منتقل کیا اور چچی کو نظر انداز کرتے ہوئے پلاؤ پر ٹوٹ پڑی۔

دوسرے روز اس کے میکے سے بوہڑے والے آ گئے۔ بڑا بھائی، چچا اور چھوٹی بھتیجی۔ سب کی آمد سے اسے خوشی ہوئی، چچا سے ملتے ہوئے وہ نظریں چرا رہی تھی، بھائی سے آنکھیں ملاتے ہوئے وہ شرما رہی تھی، البتہ چھوٹی بھتیجی کو اس نے بھینچ لیا تھا۔ ناشتے پانی کی رسم سے فراغت پانے کے بعد سسرال والوں نے اسے رخصت کیا۔

اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اک پل کی خاطر جھجکی تھی۔ دوسرے ہی پل بھتیجی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ دروازہ پر ماں اور بھابھیوں نے اسے گلے سے لگایا۔ داماد کی بلائیں لیں۔ پھر اسے دالان میں لےجا کر نواڑ کے پلنگ پر بٹھا دیا۔ صابرہ کو منجھلی بھاوج اندرونی کمرے میں لے گئی، کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے درودیوار کو معنی خیز انداز میں دیکھا، اور سوچنے لگی ۔۔۔ اک دم سے سب کچھ کتنا بدل جاتا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ میرا گھر تھا۔۔۔ میں کُدکڑیاں بھرتے بڑی ہو گئی اور۔۔۔ کل سے میرا گھر۔۔۔ میرا نہیں رہا۔ اور وہ مکان جو اس سے بڑا ہے، جس کے صحن میں کئی پلنگ بچھتے ہیں، اک دم سے میرا ہو گیا۔ وہ بوڑھی عورت، جسے دو روز پہلے تک میں بوڑھی پلکھی کہا کرتی تھی، اب میری ساس ہے۔

اسے نئے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کے لمحات یاد آئے۔ رکشا سے اتار کر جب دولھا نے مجھے چڈی چڑھایا تھا اور اپنے گھر کی طرف دوڑ لگائی تھی تو عورتوں کی ہنسی نے دیر تک ہم دونوں کا پیچھا کیا تھا۔ پھر دروازے پر پلکھی دودھ کا کٹورا لیے کھڑی تھی۔ بڑی جٹھانی نے میرے داہنے پیر کی جُراب اتاری تھی اور چھوٹی تسلا سنبھالے اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔ پلکھی نے میرے پَیر دودھ سے دھلائے۔ اس کے فوراً بعد قرآن شریف کے نیچے سے نکل کر ہم دالان میں پہنچے۔ مجھے سرخ مسند پر بٹھا دیا گیا۔ وہاں میرے پیر میرے میاں نے دھلوائے۔ تسلے میں جمع میرے پیر کی دھوں دیواروں پہ چھڑکی گئی۔ پھر ایک آئینہ ہمارے بیچ دھر کر اس پر کلام مجید رکھ دیا گیا، اور شاہانے کی چادر ہمیں اڑھا دی گئی۔ دو اجنبی مگر اپنے ہاتھوں نے قرآن شریف کھولا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میاں نے ایک دم قرآن اٹھا لیا۔ آئینے میں ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی۔

اچھے ہیں۔

"کیسی ہے صبّو؟" منجھلی بھاوج کی آواز پر وہ چونکی اور سر جھکا کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

"اری سرماوے ہے میری بنّو۔۔۔ اب سرمانا کیسا۔۔۔ دیکھیے اِدھر۔۔۔ اور بتا۔۔۔ میاں کیسا لگا؟" اس نے منجھلی بھابھی کے سوالات پر چپ سادھ لی۔

"ارے بتا بھی، سرماوے مت، اچھا یو ہی بتا دے، منھ دکھائی میں کیا دیا میرے نندوئی نے؟" منجھلی کے سوالات ختم ہونے سے پہلے بڑی بھابھی چلی آئی۔ اس نے بھی ان ہی سے ملتے جلتے سوالات کیے۔ اس کے بعد اس کی سکھیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ سکھیوں سے باتیں کرتے کرتے اس نے اپنے پیٹ میں ایک گولا سا گھومتا محسوس کیا۔ فوراً ہی اس نے نظریں گھما کر باورچی خانے کو دیکھا۔ باورچی خانے کی چھت سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے سہیلی سے پانی منگوایا اور پانی پی کر دوبارہ باتوں میں شریک ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پلیٹیں بولنے لگیں۔ اس کے میاں کے ساتھ، چچا، دور کے کچھ عزیزوں، اور بھائیوں نے کھانا کھایا۔ منجھلی بھابھی نے سالن کا پیالا، روٹیاں اور خشکے کی پلیٹ ماں کے سامنے رکھ دی، پھر دونوں بھاوجوں نے تمام چینی کی پلیٹیں، اپنے چینی پوتوں کے آگے بڑھائیں۔ منجھلی باورچی خانے میں ہی

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایک میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے
ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner

نوالے توڑنے لگی تو بڑی نے اس سے کہا،

"جا، صبو کو کھانا دیا۔"

"ابھی جاؤں ہوں۔ دو نوالے تو ٹھونس لوں۔ بیاہ کا گھر تو شیطان کا گھر بن جاوے۔ کھانے کا ہوس نہ پینے کا۔" خوب اچھی طرح کھا پی چکنے کے بعد اور لمبی لمبی ڈکاریں لیتے ہوئے وہ اٹھی تھی اور جب صابرہ کے سامنے اس نے کھانا رکھا تھا تو اسے پلاؤ یاد آ گیا۔ صبح کا ناشتہ۔ سوجی کا حلوہ، دال موٹ اور پیڑے۔

"اری تو بتاتے کی نا؟ کیسی لگی تجھے سسرال؟" کسی سکھی نے پوچھا۔

صابرہ نے چینی کی پلیٹ میں سالی کی تل چھٹ، یکّہ و تنہا بوٹی، آلو کے ٹکڑوں اور دو روٹیوں پر نظریں جماتے ہوئے اپنی سہیلی کو جواب دیا،

"اچھی۔ بہت اچھی۔ بہت ہی اچھی لگی۔"

پلاؤ کی ایک پلیٹ سے اٹھنے والی بھاپ سے بنا اچھائی کا تصوراتی ہیولا وقت کی ہوا نے جلد ہی بکھیر دیا۔ تب صابرہ کو احساس ہوا کہ میکے اور سسرال میں اک ذرا سا فرق ہے۔ شادی سے پہلے گھر میں تھکےماندے باپ کی پنڈلیاں دبانے کی ذمےداری اسی کی تھی۔ جب تک بھائیوں کا بیاہ نہیں ہوا تھا، تو دیوار کے سہارے بھائیوں کے پیروں پہ کھڑے ہو کر ان کے پیر دبانا بھی اسی کے فرائض میں شامل تھا۔ ماں کو چولھےروٹی سے فرصت ملتی تو وہ اس سے گائے بھینس کا گوبر منگواتی۔ پورے مکان میں ٹشلا ٹشلا گوبر چاروں کونوں میں ڈال دیا جاتا۔ پھر چکنی مٹی سے گوبر گوندھا جاتا۔ دیواروں اور زمین پر گوبری پھیری جاتی۔ آخر میں ماں اور بیٹی مل کر چولھاپوتا کرتیں۔

پندرہ بیس روز تک ہی ان کاموں سے اسے نجات ملی تھی۔ سب سے پہلے اس کے دلھن بنے رہنے پر بڑی جٹھانی معترض ہوئی تھی۔ دو روز بعد چھوٹی نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا،

"بھنو، بیٹھے بیٹھے کاہل ہو جاوے گی۔ ذرا ہاتھ پاؤں چلا۔"

اس سے اگلے روز اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے پلکھی اس کے پاس آن بیٹھی تھی۔ کافی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا تھا،

"کل کی تاریخ اچھی ہے گی۔ تو کل باورچی خانےمیں جا کے دیگچیوں میں ہاتھ لگا لے۔"

اگلے روز سہ پہر کے وقت محلّے کی عورتوں کی موجودگی میں پلکھی نے اس سے زردہ پکوایا۔ اور اس کے بعد رات کے کھانے کی ذمےداری تینوں بہوؤں نے مل جل کر انجام دی۔ لیکن بھرے پُرے گھر کو کھانا کھلانے کی ذمےداری مستقل طور پر اس کے سپرد کر دی گئی تھی، اور اسی رات پہلی مرتبہ سسرال سے متعلق اچھائی کا تصور پاش پاش ہوا تھا۔ سب کو کھانا کھلا چکنے کے بعد جب اس نے اپنے میاں کے لیے کھانا اتارا تو دیگچی میں تھوڑا سا سالی اور چنگیری میں کل تین روٹیاں بچی تھیں۔ میاں کے سامنے کھانا رکھنے کے بعد پنکھا لے کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

"تو نے کھا لی؟" پہلا نوالہ توڑتے ہوئے میاں نے پوچھا۔

"کھا لوں گی۔"

مختصر سا جواب سی کر میاں نے نوالہ منہ میں رکھا۔ پھر چپڑچپڑ کرتے ہوئے وہ ڈھائی روٹیاں کھا گیا۔ پلیٹ میں بچے شوربے کو پینے کے بعد اس نے ڈکارتے ہوئے پیٹ سہلایا اور اس سے بولا،

"کھا پی کے جلدی آ جائیو۔ سوری پنڈلیوں میں دل دھڑکتا سا لگے ہے۔ تُو دو چار مٹھیاں مار دے گی تو چین پڑ جا گا۔"

برتن سمیٹ کر وہ باورچی خانے پہنچی تھی۔ میاں کے آگے کی روٹی سے اس نے دیگچی پونچھی اور چھوٹے چھوٹے نوالے حلق سے اتارتے ہوئے اپنے بابا کے متعلق سوچنے لگی۔ کافی دیر بعد پلکھی کے پکارنے پر وہ چونکی تھی۔ لوٹے کی ٹونٹی سے پیٹ بھر پانی پینے کے بعد وہ اٹھی تو اس نے پلکھی کی آواز سنی۔ وہ نیم تلے پلنگ پہ پڑی اسے بتا رہی تھی کہ دو بار تیرا میاں تجھے بلا چکا ہے۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے طاق میں سے سرسوں کے تیل کی شیشی اٹھائی، تھوڑا سا تیل ہتھیلی پر انڈیلا اور میاں کی پنڈلیوں کی مالش کرنے لگی۔

"تو کُھس تو ہے نا؟" بیڑی کے کش کا دھواں نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے اس نے صابرہ سے پوچھا۔

"ہوں۔" پنڈلی کی ابھری ہوئی نسوں کو دیکھتے ہوئے اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیسا لگے ہے تجھے؟"

"ٹھیک ہی لگے ہے۔"

"تو آ گئی، تو اب چپی پڑا ہے۔ پتا ہے تجھے، بھیّوں کو دیکھ کُڑھا کروں تھا میں۔"

"کیوں بھلا؟"

"سوچوں تھا، کب بیاہ ہو گا اور بہو پیر دباوے گی۔"

"پہلے کیا کرو تھے؟"

"پہلے---" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر مسکراتے ہوئے پوچھا" کیا کرے گی پوچھ کر؟"

"یوں ہی پوچھوں ہوں میں تو۔"

"گھر آتے ہوئے چنگی کے ڈھورے دو روپے کی پی لوں تھا۔"

"اور اب؟"

"اب بھی آٹھ بارہ آنے کی لگا لوں ہوں۔"

"ایک بات کہوں۔"

"ہاں بول۔"

"رکسا چھوڑ کچھ اور کام کر لو۔"

"کیوں؟"

"کب تک چلے گی رکسا؟"

"ہاتھ پاؤں چلیں ہیں تب تک۔"

Scanned with CamScanner

"اور کیا کما لو ہو؟"
"یہی پان سات رپلّی کی دیہاڑی ہی جاوے ہے۔"
"بس؟"
"اری کماؤں تو اور بھی ہوں۔ پر بکھیڑے بھی ہیں گے۔ تین روپے سورے رکسا والے کو دینے پڑیں، کرائے کے۔ ٹوٹ پھوٹ میرے اوپر ہے گی۔ دوپہری میں سہر ہی میں کچھ کھا پی لوں ہوں۔ اس طرح بچیں وہی پان سات ہیں گے۔"
"ناج کم پڑے ہے گھر میں۔" اس نے دھیمے سے کہا، "ایک آدھ روٹی اور پک جایا کرے تو اچھا ہے۔"
"کیوں؟"
"مانو کبھی کوئی مہمان ہی آ جا۔"
"آٹا تو ہووے ہے، اور پکا لیا کر۔"
"پر۔۔۔"
"اری چھوڑ۔۔۔ یہ سارا ننتا بڑی بھابھی کا ہے۔ وہی منگوائے ہے راسن۔ اسی سے کہیو۔"
دو چار روز بعد اس نے دو مٹھی آٹا زائد کونڈے میں ڈالا تو سب سے پہلے بڑی جٹھانی نے ٹوکا۔ پھر چھوٹی نے منہ بناتے ہوئے اس کے میاں کی کمائی پر حقارت سے تبصرہ کرتے ہوئے اسے کفایت شعاری کا سبق پڑھایا۔ اس نے انصاف طلب نظروں سے پلکھن کی طرف دیکھا۔ نیم کے پیڑ تلے بیٹھی پلکھن نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا،
"عورت کی بھوک میاں کو کِھلا کر مِٹے ہے باؤلی۔"
پلکھن کا جواب سن لینے کے بعد اس کی آنکھوں میں ماں کا چہرہ ابھر آیا۔ اپنے گھر میں، ایک مرتبہ اس نے جب اسی مسئلے پر بات کی تھی تو ماں نے کہا تھا،
"باؤلی! کمانے والے کا پیٹ بھر جا تو ہماری بھوک آدھی ہو جاوے ہے۔"

جھاڑو برتن، چولہا اور خدمت گزاری کرتے ہوئے دن بیت رہے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ بڑی جٹھانی کے متغیر ہوتے جسم کو دیکھ دیکھ کڑھتی اور سوچنے لگی کہ گِنی چُنی روٹیوں کا حصہ بخرا کرنے کی خاطر ایک اور زندگی دنیا میں آنے والی ہے۔

اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا، جب بڑی جٹھانی کی چیخ پکار سے پڑوسیوں کو بھی پتا چل گیا کہ آج اس گھر میں نیا مہمان آنے والا ہے۔ وزیری دائی نے پان کا بیڑا کلّے میں دباتے ہوئے منجھلی اور اس کی مدد سے دالان میں ذرا سا گڑھا کھودا۔ پھر اس کے آس پاس دو اینٹیں جما کر بڑی کو ان پر اکڑوں بٹھا دیا گیا۔ پلکھن کی ہدایت پر اس نے باورچی خانہ سنبھالا۔ کھانا وہ تقریباً تیار ہی کر چکی تھی۔ وزیری اور پلکھن کے کہنے پر تسلے میں پانی بھر کر اس نے چولھے پر رکھ دیا۔ گھر کے لونڈے بالے کھدیڑ دیے گئے۔ بڑی جٹھانی کی چیخوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پلکھن اور منجھلی تسلیاں دے رہی تھیں، لیکن اس کی ہائےوائے میں کمی نہیں ہو

رہی تھی۔ جھنجھلا کر پلکھن نے اونچی آواز میں بڑی بہو کو ڈانٹ پلائی،
"اے نوج۔۔۔ تُو تو یوں ڈڑوک رہی ہے گی جیسے پہلونٹی کا بچہ جن رہی ہو۔"
پلکھن کی آواز پر چونک کر اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اینٹوں پر بیٹھی جٹھانی کو دیکھا۔ آنکھوں میں براجے خوف پر رحم کا جذبہ غالب آتے ہی اس نے گردن گھمائی اور پُھکنی اٹھا کر اُپلوں کی آگ روشن کرنے لگی۔ چیخوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور ان ہی چیخوں کے درمیان ایک ننھی سی چیخ بھی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ بےساختہ تھالی اور پھکنی لے کر ایک دم سے وہ اٹھی اور جونہی پلٹی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بڑی، چھوٹی سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وزیری نے جلدی سے بچے کی نال کاٹ کر زچہ کو دیکھا اور دو منٹ بعد ہی بڑی کی موت کا اعلان کر دیا۔ وہ پُھکنی اور تھالی پھینک کر پلکھن کے پاس پہنچی۔ پلکھن نے روتے روتے اسے باورچی خانے میں جانے کی ہدایت کی۔
بڑی کی موت کی خبر دیواریں پھلانگتی گڑھی کے ہر گھر میں پہنچ چکی تھی۔ برادری کے ہی کسی آدمی نے منٹوں میں یہ خبر گھر کے مردوں تک پہنچا دی۔ تینوں بھائی اپنی اپنی رکشائیں ساتھ ہی لائے تھے۔ بڑا سر جھکائے، بچوں کو سنبھال کر مردانے میں بیٹھ گیا۔ برادری والے کفن دفن کے انتظام میں جُٹ گئے۔ گھر میں عورتوں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور صابرہ باورچی خانے میں بیٹھی اپنی بھیگی آنکھوں سے چاول، سالن کی دیگچیوں اور روٹی کی چنگیری کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

آج

خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی　ستیہ جیت رے　اسد محمد خاں
محمد خالد اختر　ڈونلڈ بارتھیم　ولیم سیرویاں
افضال احمد سیّد　ذی شان ساحل　نسرین انجم بھٹی
سعیدالدین　نیّر مسعود　فروغ فرخ زاد　بابا مقدّم

سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ　لیو تالستائی　کیم مونترو
مظفر علی سیّد　فہمیدہ ریاض　عذرا عباس
احمد فواد　محمد خالد اختر　اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰

اِتالو کلوینو　امیں مالوف　محمد عمر میمن
محمد سلیم الرحمٰن　جیک لنڈن　محمد انور خالد
زیبا الیاس　محمد خالد اختر　تادیوش روزیوچ
زبگنیو ہربرٹ　وِسلاوا شمبورسکا　الیگزانڈر واٹ

گرما ۱۹۹۰

وِجے دان دیتھا　انور خاں
حسن منظر　محمد سلیم الرحمٰن
شمس الرحمٰن　شمس الحق
فہمیدہ ریاض

آج کی کتابیں

انتخاب

خورخے لوئس بورخیس

(Jorge Luis Borges)

rekhta
Scanned with CamScanner

خورخے لوئس بورخیس

زخم کا ہلال

اس کے چہرے پر ایک گہرے زخم کا منحوس نشان تھا۔ راکھ کے رنگ کا یہ داغ ایک مکمل قوس بناتے ہوئے کنپٹی سے آدھے رُخسار تک گہرا اتر گیا تھا اور اس کے دونوں کناروں پر جلد کِھنچی ہوئی تھی۔

اس کے اصل نام کی کوئی اہمیت نہیں۔ تاکوارامبو میں اسے ہر کوئی "لاکلورادا کا انگریز" کے نام سے بلاتا تھا۔ کاردوسو نے اُسے زمینیں بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کے جواب میں اس نے ایک غیرمتوقع دلیل پیش کی۔ یعنی کاردوسو پر اس نے اپنے زخم کے نشان کا راز آشکار کر دیا۔

یہ انگریز ریوگراندوبل سُر یعنی سرحد سے آیا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ برازیل میں وہ اسمگلر رہا تھا۔ ان زمینوں پر جو اس نے کاردوسو سے خریدی تھیں، گھاس اُگ آئی تھی، اور کنوؤں میں کھاری پانی تھا۔ اس نے خود اپنے مزدوروں کے ساتھ مل کر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے سخت محنت کی۔ کہتے ہیں کہ وہ ظلم کی حد تک سخت گیری کرتا تھا، لیکن اتنی ہی سختی سے عدل و انصاف کا پابند بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ پیتا بہت تھا۔ سال میں کئی مرتبہ یوں ہوتا کہ وہ ایک کمرے میں دو دو تین تین دن تک بند ہو جاتا، اور جب وہ بند کمرے سے باہر نکلتا تو اس کی حالت غیر ہوتی۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا، پریشان خاطر، کانپتا، لرزتا ہوا، جیسے وہ ابھی ابھی کسی لڑائی کے میدان سے بھاگ آیا ہو، یا گھمبیر کی کیفیت سے نکلا ہو۔

اس کی برفانی، پتھرائی ہوئی آنکھیں مجھے خوب یاد ہیں، اور وہ پھُرتیلا، چھریرا جسم اور بھوری مونچھیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان بول لیتا تھا، لیکن اس میں برازیلی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی۔ اسے کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کی ڈاک بھی ایک آدھ کاروباری خط اور ایک آدھ پمفلٹ پر محدود تھی اور بس۔

جب میں آخری دفعہ ان شمالی صوبوں سے گذرا تھا، کاراگواتا ندی میں سیلاب آ گیا تھا۔ لہٰذا مجھ رات بھر لاکلورادا میں رکنا پڑا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے احساس ہو گیا کہ میرا آنا اُسے ناگوار گذرا ہے۔ میں نے اس کی طرف دستِ رفاقت بڑھایا اور اس کے جذبہٗ حب الوطنی کو اپیل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ میں نے انگلستان کی ناقابلِ تسخیر قوت کا تذکرہ کیا۔ میرے ساتھی نے مجھ سے اتفاق کیا، لیکن ساتھ ہی ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ وہ انگریز نہیں بلکہ آئرش ہے۔ یہ کہہ کر وہ یوں چپ ہو گیا جیسے اس نے ایک گہرے راز کا انکشاف کر دیا ہو۔

رات کے کھانے کے بعد ہم صحن میں باہر نکل آئے۔ آسمان صاف تھا، لیکن جنوب میں پہاڑیوں کے اُس پار بجلیاں فضا کو چیر رہی تھیں اور آسمان کے بطن میں ایک طوفان پل رہا تھا۔ ہم ڈائننگ روم میں واپس آ گئے۔ لڑکا کھانے کی میز صاف کر کے رَم کی ایک بوتل لے آیا اور ہم کچھ دیر خاموشی سے پیتے رہے۔ نہیں معلوم کتنی رات گئی تھی جب میں نے محسوس کیا کہ میں بہت زیادہ پی گیا ہوں، اور جانے کس نشے میں، کس وجدانی کیف و سرُور کے تحت، میں نے اس کے چہرے کے داغ کا ذکر چھیڑا۔ اس کا چہرہ ایک دم متغیر ہوگیا۔ چند لمحوں تک میں یہ سوچتا رہا کہ وہ مجھے گھر سے باہر نکال دے گا۔ لیکن تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بالکل نارمل آواز میں بولا،

"اس زخم کی داستان میں تمھیں سناؤں گا۔ لیکن اس شرط پر کہ تم اسے من وعن بیان کرو گے۔ جن شرمناک حالات میں مَیں نے یہ زخم کھایا، اور اس داغ سے جو ذلّت و رسوائی وابستہ ہے، اسے بغیر کسی رُو رعایت کے یا کمی بیشی کے اسی طرح پیش کیا جائے۔"

میں نے یہ شرط منظور کر لی، اور اب یہ داستان اسی طرح بیان کر رہا ہوں جیسے اس کے منھ سے سُنی تھی۔ (اس نے اپنی کہانی انگریزی میں سنائی تھی، لیکن یوں کہ انگریزی میں وہ بلاتکلف ہسپانوی اور پرتگیزی الفاظ اور فقرے شامل کر دیتا تھا۔)

OOOOO

۱۹۲۲ میں کوناٹ کے ایک شہر میں مَیں ان لوگوں میں شامل تھا جو آئرلینڈ کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں میں بعض ابھی زندہ ہیں؛ اور چند ایک قسمت کی ستم ظریفی سے ابھی تک لڑ رہے ہیں، سمندروں اور صحراؤں میں، اسی برطانوی جھنڈے کے نیچے جس کے خلاف انھوں نے بغاوت کی تھی۔ اور ایک، ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ لائق ستائش اور بلند و بالا تھا، وہ ہلاک کر دیا گیا۔ اُس وقت ابھی پَو پھٹ رہی تھی اور سپاہیوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، تاہم انھوں نے اسے اپنے بیرکوں کے چوک میں گولیوں سے چھلنی کر ڈالا۔

چند دوسرے ساتھیوں نے اس خانہ جنگی کے بےنام مخفی محاذوں پر اپنی تقدیر کا سامنا کیا۔ یہ لوگ زیادہ خوش قسمت تھے جو میدانِ کارزار میں کام آئے۔

ہم لوگ ری پبلکن تھے اور کیتھولک۔ اور ہم لوگ رومانوی خواب دیکھنے عادی تھے۔

Scanned with CamScanner

آئرلینڈ ہمارے لیے صرف ایک "یوٹوپین مستقبل" اور "ناقابلِ برداشت حال" ہی نہیں تھا۔ اس سے بہت سی آرزوئیں، خوش آئند خواب، بلکہ ایک پوری دیومالا وابستہ تھی۔ وہ مدوّر مینار اور سُرخ دلدل اور پارنیل کی تردید اور رزمیہ نظموں کی شان --- یہ سب کچھ تھا۔ یہ رزمیہ نظمیں اُن سانڈوں کے قصیدے گاتی تھیں جو کسی جنم میں بہادر ہیرو تھے، کسی جنم میں مچھلیاں، اور کسی میں پہاڑ۔

ایک دوپہر، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا، منسٹر سے ایک جواں ہم میں آ ملا۔ اس کا نام جُوں ونسنٹ مُوں تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی بیس سال کی ہو گی۔ دُبلا پتلا، کمزور اور بےجان؛ پلپلا سا جسم جیسے اس میں کوئی ہڈی ہی نہ ہو۔ بڑے جوش و خروش اور بےجا غرور کے ساتھ اس نے کسی کمیونسٹ مینوئل کا ایک ایک صفحہ پڑھ رکھا تھا۔ اس کے پاس ہر بحث کا آخری اور قطعی جواب جدلیاتی مادّیت میں موجود تھا۔ کسی آدمی کو چاہنے یا کسی سے نفرت کرنے کے اسباب بےحساب ہو سکتے ہیں۔ ونسنٹ مُوں کے لیے ساری کائنات کی تاریخ ایک اقتصادی کشمکش تک محدود تھی، اور اس کے لیے انقلاب کی کامیابی ازل سے لکھی گئی تھی---

رات کی تاریکی چھا رہی تھی اور ہماری بحث تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ ہم دالان میں بیٹھے بحث کرتے رہے، سیڑھیوں سے اُترتے بحث کرتے رہے، گلیوں میں گھومتے بحث کرتے رہے۔ میں نہ اس کے صریحی فیصلوں سے متاثر ہوا، نہ اس کے لہجے کی قطعیت سے۔ ہمارا یہ نیا کامریڈ بحث و تمحیص کا قائل ہی نہ تھا۔ وہ بندھی ٹکی رائیں رکھتا تھا اور قدرے غصّے اور تحقیر کے ساتھ انھیں منوانے پر تُلا رہتا تھا۔

جب ہم شہر سے باہر نکل آئے تو اچانک ایک جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ہم ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ غالباً ہم بیرکوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ہم ایک کچے راستے پر ہو لیے۔ اتنے میں ایک سپاہی ایک جلتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ سُرخ شعلوں کی روشنی میں وہ ایک دیوزاد معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے چلّا کر حکم دیا "رُک جاؤ!" میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ لیکن میرا ساتھی میرے پیچھے نہیں آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ جوں ونسنٹ مُوں جیسے مسحور ہو کر بےحس و حرکت کھڑا تھا۔ وہ خوف سے منجمد ہو گیا تھا۔ میں واپس بھاگ آیا، اور اس سپاہی کے ایک گھونسا رسید کر کے اسے زمین پر چت گرا دیا۔ پھر میں نے ونسنٹ مُوں کو پکڑ کر خوب ہلایا۔ اور اسے ایک گالی دے کر کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ مجھے اس کا بازو تھام کر اسے سہارا دینا پڑا۔ کیونکہ خوف نے اسے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا۔ پھر ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس رات کی تاریکی میں، جسے شعلوں کی تلواریں چیر رہی تھیں، رائفل کی گولیوں نے ہمارا تعاقب کیا۔ ایک گولی سَن سے مُوں کے شانے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ جب ہم صنوبر کے درختوں کے درمیان بھاگ رہے تھے، مُوں پھٹ پڑا اور آہستہ آہستہ رونے لگا۔

۱۹۲۳ کی خزاں تھی۔ ہم نے برکلے کی حویلی میں پناہ لی تھی۔ جنرل برکلے ان دنوں بنکال میں کسی اہم کام پر مامور تھے، اور ان کی حویلی خالی تھی۔ یہ حویلی سو سال پرانی تھی۔ اندھیرے کمرے، دالان در دالان، بےشمار غیرضروری اندرونی حجرے اور بھول بھلیاں کے سے

کوریڈور۔ پہلی منزل میں ایک عجائب خانہ تھا اور ایک بہت بڑی لائبریری، جس کی کتابوں سے انیسویں صدی کی تاریخ مرتب ہوتی تھی۔ عجائبات میں نیشاپور کے نیمچے تھے جن کی کمانوں پر گھمسان، خونیں لڑائیوں کے نشان ابھی تک مرتسم تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے ہم حویلی میں پچھواڑے کی طرف سے گھسے تھے۔ ونسنٹ مُوں کانپ رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ باوجود اس کے وہ کہہ رہا تھا، "آج رات کے حادثات بڑے دلچسپ تھے۔" میں نے اُس کے زخم کی مرہم پٹی کی اور اسے گرم گرم چائے کی ایک پیالی بنا کر دی۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا زخم معمولی ہے۔

اچانک اس نے استعجاب کے لہجے میں ہکلا کر کہا، "تم نے اپنے آپ کو بڑے خطرے میں ڈالا۔"

میں نے کہا، "کوئی بات نہیں۔ میرے لیے پریشان نہ ہو۔ جنگ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔" (دراصل اس کو بچانے میں میری ایک غرض یہ بھی تھی کہ ایک آدمی کی گرفتاری ساری پارٹی کے لیے خطرے کا موجب ہو سکتی تھی۔) دوسرے ہی دن مُوں نے اپنا کھویا ہوا توازن پا لیا۔ اُس نے مجھ سے سگریٹ لیا اور کش لگاتے ہوئے ہماری انقلابی پارٹی کے اقتصادی ذرائع کے بارے میں مجھ سے سختی سے استفسارات کیے۔ اس کے سوالات بڑے بچگانہ تھے۔ میں نے اسے سچی بات سمجھائی کہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ پھر میں نے مُوں کو بتایا کہ ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ جنوب میں ابھی تک رائفلوں سے آگ برس رہی تھی۔ میرا ریوالور اور اوورکوٹ میرے کمرے میں تھا۔ میں انھیں لے کر واپس آیا تو مُوں صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کیے ہوئے وہ تصوّر کر رہا تھا کہ اسے بخار چڑھا ہوا ہے، اور اس نے اپنے کندھے میں اینٹھن پیدا کر لی تھی جیسے اسے سخت درد ہو رہا ہو۔

اس لمحے مَیں سمجھ گیا کہ اس کی بزدلی لاعلاج ہے۔ میں نے اسے بڑی نرمی سے کہا کہ وہ اپنی حفاظت کرے، اور باہر چلا گیا۔ اس بزدل اور خائف آدمی کو دیکھ کر میں خود بڑی کوفت اور شرم محسوس کرتا تھا، جیسے ونسنٹ مُوں نہیں مَیں بُزدل ہوں۔ جب ایک آدمی کوئی کام کر بیٹھتا ہے تو گویا سارے آدمیوں پر اس کی ذمہ‌داری عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے یہ مناسب تھا کہ ایک آدمی کی باغِ بہشت میں خدا کے حکم سے سرتابی انسان کی اُفتاد کا باعث ہو اور ایک گناہ سے ساری انسانیت آلودہ ہو جائے۔ اور اسی طرح یہ بھی انصاف پر مبنی تھا کہ ایک آدمی کی صلیب پر قربانی ساری انسانیت کو بچا لے اور نجات کا باعث بنے۔ شوپنہار نے غالباً سچ کہا ہے کہ "مَیں سارے آدمیوں میں ہوں"؛ یعنی ہر آدمی سارے آدمیوں میں ہے۔ چنانچہ کسی نہ کسی جواز سے یہ نکمّا، بُزدل جُوں ونسنٹ مُوں اور شیکسپیئر دونوں ایک ہیں۔

نو دن اور نو راتیں ہم نے جنرل کے اس بےتحاشا بڑے مکان میں گذاریں۔ میں اس وقت جنگ کی اذیّتوں، تباہ کاریوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کا ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف اِس داغ کی تاریخی داستان سنا رہا ہوں، جو میرے چہرے پر لعنت بن کر چپک گیا ہے۔ میری یادوں میں وہ نو دن صرف ایک دن ہی گئے ہیں۔ سوائے اُس آخری دن کے جب ہمارے ساتھی

Scanned with CamScanner

بیرکوں میں گھس آئے اور ہمارے ان سولہ ساتھیوں کا بدلا چکایا جو پلفن کے چوک میں مشین گن سے ہلاک کیے گئے تھے۔ میں صبح صادق سے پہلے چھپتے چھپاتے اس گھر سے نکل گیا تھا۔ پھر میں رات کو واپس آ گیا۔ میرا ساتھی اوپر کی منزل پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے زخم کی وجہ سے وہ نیچے اتر نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں فوجی حکمت عملی کی ایک کتاب تھی ، ایف ایں ماڈیا کلاروٹز۔ "سارے جنگی حربوں میں مَیں توپوں کا قائل ہوں"، اس نے مجھ پر انکشاف کیا۔ پھر اس نے ہمارے پلانوں کے بارے میں استفسار کیا۔ وہ انھیں سنسر کرنا چاہتا تھا یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرنا چاہتا تھا۔ ہماری اقتصادی بدحالی پر وہ چیں بجبیں ہوتا تھا اور بڑی قطعیت کے ساتھ ہمارے تباہ کن انجام کی پیش گوئی کرتا تھا۔ وہ اپنی جسمانی کمزوری اور بزدلی کو چھپانے کے لیے یہ اکڑفوں دکھاتا تھا۔ بہرحال اس کے ساتھ یہ نو دن، اچھے برے، کسی طرح کٹ گئے۔

دسویں دن ہمارا شہر دشمنوں کے ہاتھ آ گیا۔ سڑکوں پر جابجا درازقد خاموش اور پرشکوہ گھڑسوار پہرا دے رہے تھے۔ شہر میں خاک اڑ رہی تھی اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ایک موڑ پر میں نے دیکھا ایک انسانی لاش زمین پر پھینکی گئی، لیکن اس کا تاثر میرے ذہن میں اس ڈمی سے زیادہ گہرا نہ تھا، جس پر چوک میں سپاہی مسلسل نشانہ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔

ایک دن میں صبح سویرے باہر چلا گیا اور دوپہر تک واپس آیا۔ مُون لائبریری میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ٹیلیفون پر بول رہا ہے۔ میں نے۔ اپنا نام سُنا اور پھر یہ کہ میں شام میں سات بجے واپس آؤں گا۔ اور پھر یہ تجویز کہ مجھے اس وقت گرفتار کر لیا جائے جب میں صحن کا احاطہ طے کر رہا ہوں گا۔ میرا سمجھ دار دوست بڑی عقلمندی سے مجھے فروخت کر رہا تھا۔ آخر میں مَیں نے یہ بھی سنا کہ وہ اپنی ذاتی حفاظت کی گارنٹی طلب کر رہا ہے۔

اور یہاں آن کر میری داستان گڈمڈ ہو جاتی ہے اور اس کا ایک سرا کہیں گم ہو جاتا ہے۔ بہرحال میں اتنا جانتا ہوں کہ میں اس غدّار کا پیچھا کرتا رہا، ان بےشمار ڈراونے گھپ اندھیرے دالانوں میں اور ان چکر کھاتے ہوئے زینوں میں جو گھمیر کی کیفیت پیدا کرتے تھے۔ مُون اس حویلی کے چپے چپے سے واقف تھا، مجھ سے کہیں زیادہ۔ دو ایک دفعہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آخر میں نے اُسے گھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ سپاہی مجھے روک سکیں، میں نے تیزی سے اُچک کر جنرل کے ہتھیاروں میں سے ایک کٹار دیوار سے اُتار لی اور اس آہنی ہلال سے اس کے چہرے پر ایک خونیں ہلال تراشا۔

بورخیس، تم کہ ایک اجنبی ہو، میں تمھارے سامنے یہ اعتراف کر رہا ہوں، تمھارا جذبۂ تحقیر مجھے کوئی رنج نہیں پہنچا سکتا۔

OOOOO

یہاں پہنچ کر راوی خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

"اور مُون؟ مُون کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے دیکھا نشے میں دُھت سپاہی چوک میں ایک "ڈمی" کا جسم گولیوں سے چھلنی کر رہے ہیں۔ اس نے اپنی بیہودا کی غداری کی قیمت وصول کی اور برازیل چلا آیا۔"

داستان کے اختتام کا میں بےسود انتظار کرتا رہا۔ سسکیوں سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے زخم کے نشان کے ہلال کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا تم میری باتوں پر یقین نہیں کرتے؟ کیا تم نہیں دیکھ سکتے کہ ذلّت و رسوائی کا یہ داغ ہمیشہ کے لیے میرے چہرے پر کندہ ہے؟ میں نے داستان اس زاویے سے اس لیے سنائی تاکہ تم آخر تک اسے تحمّل سے سُن سکو۔ جس نے میری جان بچائی، میری حفاظت کی، اس محسن سے میں نے غداری کی۔ اب مجھ سے نفرت کرو۔ میں جون ونسنٹ مُون ہوں۔"

OOOOO

(ہسپانوی)
انگریزی سے ترجمہ : ممتاز شیریں
(بہ شکریہ "ادبِ لطیف" لاہور)

المعتصم تک رسائی

فلپ گیڈالا نے لکھا ہے کہ "بمبئی کے وکیل میر بہادر علی کا ناول "المعتصم تک رسائی" مترجموں کے لیے مسلسل ترغیب کی حامل اسلامی تمثیلی نظموں اور ان سراغ رسانی کے ناولوں کا ایک بےجوڑ سا آمیزہ ہے جو ناگزیر طور پر جان ایچ واٹسن سے سبقت لے جاتے ہیں اور برائٹن کے بےداغ بورڈنگ ہاؤسوں کی زندگی کی دہشت کو رونما کرتے ہیں۔" اس سے پیشتر مسٹر سیسل رابرٹس بہادر علی کی کتاب کے بارے میں خاصی چبھتی ہوئی رائے دے چکے ہیں، اور "ولکی کولنز اور بارہویں صدی کے فارس کی ممتاز شخصیت فرید الدّین عطار کے اس دوغلے اور بعید ازقیاس آمیزے" کی تنقیص کر چکے ہیں، جو خاصی ٹھوس رائے ہے جسے گیڈالا نے، کسی خاص ترمیم کے بغیر، بلکہ ایک بغض زدہ لہجے میں، دوہرا دیا ہے۔ دونوں ناقدین میں بنیادی طور پر اتفاقِ رائے ہے؛ دونوں اس ناول کی سراغ رسانی کے ناولوں جیسی ہیئت اور ایک رمزیانہ زیریں رَو کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شاید یہ دوغلا پن ہمیں یہ خیال کرنے پر اُکسائے کہ اس میں اور چیسٹرٹن میں کوئی مشابہت ہے! ہم جلد ہی دیکھیں گے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

"المعتصم تک رسائی" کا اصل ایڈیشن ۱۹۳۲ کے آخر میں بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اخباری کاغذ کے درجے کا کاغذ استعمال کیا گیا تھا، اور سرورق پر ایک عبارت خریدار کو مطلع

Scanned with CamScanner

کرتی تھی کہ یہ کتاب بمبئی کے کسی باشندے کے قلم سے سراغ رسانی کا پہلا ناول ہے۔ چند مہینوں کے اندر اندر لوگوں نے اس کتاب کے، ایک ایک ہزار نسخوں پر مشتمل، چار ایڈیشن خرید لیے۔ بومبے کوارٹرلی ریویو، بومبے گزٹ، کلکتّا ریویو، ہندوستانی ریویو (الٰہ آباد) اور کلکتا انگلش مین نے اس کتاب پر توصیفی تبصرے کیے۔ اس توصیف سے متاثر ہو کر بہادر علی نے کتاب کا ایک مصوّر ایڈیشن شائع کیا، جسے اب اس نے "المعتصم نامی شخص سے مکالمہ" کا عنوان، اور "گھومتے ہوئے آئینوں کا کھیل" کا نہایت خوبصورت ذیلی عنوان دیا۔ یہی وہ ایڈیشن ہے جسے حال ہی میں لندن میں وِکٹر گولانٹز نے دوبارہ تیار کر کے شائع کیا ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں ڈوروتھی ایل سیئرز کا لکھا ہوا ابتدائیہ شامل ہے، اور تصویریں، غالباً ہمدردی کے زیرِ اثر، حذف کر دی گئی ہیں۔ یہی ایڈیشن اس وقت میرے سامنے ہے۔ پہلا ایڈیشن حاصل کرنے میں، جو میرا قیاس ہے کہ اس سے کہیں بالاتر رہا ہو گا، مجھے کبھی کامیابی نہیں ہو سکی۔ قیاس پر مبنی اس فیصلے میں مجھے اس ضمیمے کی وجہ سے استناد حاصل ہے جس میں ۱۹۳۲ کے پہلے ایڈیشن اور ۱۹۳۳ کے ایڈیشن میں پائے جانے والے فرق سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کو پرکھنے اور اس کی خوبیوں پر بات کرنے سے پہلے میرے لیے یہ بہتر ہو گا کہ میں اس کی کہانی کے مجموعی سفر کی تیزی سے نشان دہی کر دوں۔

اس کا مرکزی مرثی کردار -- جس کا نام ہم کبھی نہیں جان پاتے -- بمبئی کا ایک قانون کا طالب علم ہے۔ وہ نئے خیالات کے زیرِ اثر، اپنے اجداد کے اسلامی عقیدے پر یقین نہیں رکھتا، لیکی قمری ماہ محرّم کی دسویں رات، شام پڑے، وہ خود کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک بلوے میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ رات ڈھول اور سلاموں کی آوازوں سے پُر ہے۔ مسلمانوں کے جلوس کے بڑے بڑے کاغذی تعزیے مختلف قسم کے لوگوں کے انبوہ میں سے اپنی راہ بنا رہے ہیں۔ ایک چھت پر سے کسی ہندو کی پھینکی ہوئی اینٹ اڑتی ہوئی آتی ہے؛ ایک شخص دوسرے کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیتا ہے؛ ایک شخص -- ہندو یا مسلمان -- مارا جاتا ہے اور پیروں تلے آ کر روندا جاتا ہے۔ تین ہزار آدمی لڑ رہے ہیں؛ چھتری کے سامنے ریوالور، مغلظات کے مقابل کوسنے، ناقابلِ تقسیم خدا کے روبرو اُن گنت دیوتا۔ آزاد خیال طالب علم بھی ششدر ہو کر بلوے میں شریک ہو جاتا ہے۔ ناامید ہاتھوں سے وہ ایک ہندو کو مار ڈالتا ہے (یا سمجھتا ہے کہ اس نے مار ڈالا ہے)۔ سرکار کی پولیس -- گھڑسوار، ٹاپوں کی آواز سے بہرا کرتی ہوئی، نیم خوابیدہ -- اپنے غیرجانبدار اسلحہ کے ساتھ مداخلت کرتی ہے۔ تقریباً گھوڑوں کے سُموں کے نیچے سے طالب علم فرار اختیار کرتا ہے اور شہر کے سب سے دورافتادہ مضاف کا رخ کرتا ہے۔ وہ ریل کی دو پٹریوں کو پار کرتا ہے، یا شاید ایک ہی پٹریوں کو دو مرتبہ۔ وہ ایک پُرپیچ باغ کی دیوار پر چڑھتا ہے، جس کی پشت پر ایک گول مینار بلند ہو رہا ہے۔ گلاب کی جھاڑیوں کے عقب سے "دودھیا رنگت کے شکاری کتّوں کا ایک چھدرا شیطانی غول" نمودار ہوتا ہے۔ بری طرح گھبرا کر وہ مینار میں پناہ لیتا ہے۔ وہ لوہے کی ایک نسینی پر چڑھتا ہے، جس کے کچھ ڈنڈے غائب ہیں، اور بالآخر مینار کی گول چھت پر پہنچ جاتا ہے، جس کے بیچوں بیچ ایک اندھیرا کنواں ہے۔ وہاں اسے ایک غلیظ آدمی ملتا ہے، جو چاند کی روشنی میں اکڑوں بیٹھا پیشاب کر رہا ہے۔ وہ

اسے رازدار بناتا ہے کہ اس کا پیشہ سفید کپڑے میں کفنائے ہوئے مردوں کے سونے کے دانت چ
ہے جنھیں پارسی مینار میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اسی طرح کی اَور بھی خباثت بھری باتیں
ہے اور بتاتا ہے کہ اسے بھینس کے گوبر سے خود کو پاک کیے ہوئے چودہ راتیں گذرگئی ہیں
بڑی نفرت سے گجرات کے کچھ رسّا گیروں کا ذکر کرتا ہے؛ "وہ کتّوں اور چھپکلیوں کے کھ
والے ہیں اور ایسے ہی گندے ہیں جیسے تم اور میں"۔ رات رفتہ رفتہ ڈھلنے لگتی ہے اور فضا
گدھوں کی نیچی آزانوں سے بھر جاتی ہے۔ تھکی سے چُور ہو کر طالب علم کو نیند آ جاتی
جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سورج چڑھ آیا ہے، اور کفن چور جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ طا
علم کی جیب سے چند ترچناپلی سکّار اور چاندی کے کچھ روپے بھی غائب ہیں۔ پچھلی رات
ہولناکیوں کے زیرِ اثر، وہ خود کو ہندوستان کی پیچیدگی میں گم کر دینے کا قصد کرتا ہے
اس فکر میں غرق ہے کہ اس نے کس طرح خود کو ایک بت پرست کی جان لینے کے قابل
کیا، جب کہ اسے یہ بھی یقین نہیں کہ ایک مسلمان کے معتقدات ایک ہندو کے معتقدات
نسبت زیادہ درست ہیں۔ وہ اپنے ذہن سے گجرات کا نام نہیں نکال پاتا، اور نہ پالی پور کی
ملکہ سانسی (رہزنوں کی ذات کی عورت) کا، جو کفن چور کی نفرت اور حقارت کا ہدف
غور کرنے پر اسے ایک اتنے خبیث شخص کے بغض کا ہدف ایک خاص توصیف کا مستحق
ہوتا ہے۔ وہ مایوسی کے عالم میں اس ملکہ سانسی کو تلاش کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ مختصر
دعائیہ وقفے کے بعد وہ، ایک پُرسکون ناتوانی کے ساتھ، اپنے طویل سفر کا آغاز کرتا ہے، اور
اس تحریر کا دوسرا باب انجام کو پہنچتا ہے۔

بقیہ اٹّیس ابواب کے نشیب و فراز کا خاکہ بنانا ناممکن ہے۔ اس میں، ذلّت و خواری
لے کر ریاضیاتی غوروفکر تک، انسانی روح کے سفر کے تمام امکانات تمام کرتی ہوئی
سوانح، اور ہندوستان کے وسیع جغرافیے پر پھیلی ہوئی مسافرت کے علاوہ، ڈرامائی ذات
پیچیدہ بارآوری کا بیان موجود ہے۔ بمبئی سے شروع ہونے والی کہانی پالی پور کی گھاٹیوں
آگے بڑھتی ہے، بیکانیر کے پتھریلے پھاٹکوں پر ایک سے پہر اور ایک رات کے لیے ٹھہرتی
بنارس کے ایک نالے میں ایک اندھے نجومی کی موت کا احوال بیان کرتی ہے، کلکتّے کی و
عفونت کے درمیان مچھوا بازار میں عبادتوں اور مباشرتوں میں ملوث ہوتی ہے، مدراس کے
دفتر کی کھڑکی سے سمندر پر دنوں کو طلوع ہوتے دیکھتی ہے، ریاست ٹراونکور کی ایک بالا
سے شاموں کے سمندر میں ڈوب کر مرنے کا نظارہ کرتی ہے، اندلپور میں ٹھٹکتی اور ایک
کی روداد سناتی ہے، اور بالآخر اپنے برسوں اور فرسنگوں کا دائرہ بمبئی ہی میں، دودھیا رن
والے شکاری کتّوں کے باغ سے چند قدم دور، مکمل کرتی ہے۔

کہانی کا پلاٹ اس طرح ہے؛ ایک شخص -- ہمارا جانا پہچانا بےعقیدہ اور مغرور طا
علم -- اَسفل تریں درجے کے لوگوں میں جا پڑتا ہے، اور خود کو ایک طرح کی ذلّت کی مسا
میں ان کے درمیان ڈھال لیتا ہے۔ اچانک -- اس محیّرالعقول سراسیمگی کے ساتھ، جو ریت
انسانی قدموں کے نقوش دیکھ کر رابنسن کروزو پر طاری ہوئی تھی -- اسے اُس وقت اِس

Scanned with CamScanner

میں ایک طرح کی تسکین کا ادراک ہوتا ہے جب وہ ان میں سے ایک گھناؤنے شخص میں ایک ملائمت، ایک سربلندی اور ایک ٹھہراؤ کی جھلک دیکھتا ہے، "بالکل اس طرح جیسے مکالمے میں ایک گمبھیر شخص بھی شامل ہو گیا ہو"۔ اسے خوب علم ہے کہ اس سے بات کرتا ہوا وہ گھٹیا شخص ایسی ارفع شائستگی برتنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایک لمحے کے لیے کسی دوست کا، یا کسی دوست کے دوست کا، عکس اس شخص میں جھلکا تھا۔ اس مسئلے پر بار بار غور کرنے پر وہ اس باطنی یقین تک پہنچتا ہے کہ دنیا میں کسی نہ کسی جگہ ایک شخص ہے جس سے اس پاکیزگی کا ظہور ہوا ہے، کہیں نہ کہیں کوئی ہستی ہے جو بجائے خود یہ پاکیزگی ہے۔ طالب علم اپنی زندگی کو اس کی جستجو سے منسوب کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔

اس طرح کتاب کا بنیادی خیال اپنی جھلک دکھاتا ہے، ایک شخص تک رسائی پانے کی لاانتہا جستجو۔ اس دھندلی چمک کی گریزپا جھلکیوں کے سہارے، جو اس شخص نے دوسروں میں چھوڑ دی ہیں ، ابتدا میں کسی لفظ یا مسکراہٹ کی چمک، اور آخر میں دانائی، تخیل اور سچائی کی متنوّع اور دم بدم بڑھتی ہوئی خیرہ کن روشنیاں۔ اس جستجو کے دوران جن لوگوں سے سوالات کیے جاتے ہیں، المعتصم سے زیادہ قریبی واقفیت کی نسبت سے ان کا الوہی حصہ بھی بڑھتا جاتا ہے، اگرچہ یہ بات ہمیشہ واضح رہتی ہے کہ وہ محض آئینے ہیں۔ یہاں ریاضی کی تیکنیکیت کا اطلاق ہوتا ہے، بہادر علی کا پُرپیچ ناول ایک مخروطی ارتقا ہے، جس کا بلندترین نقطہ "المعتصم نامی شخص" کی حسّیاتی پیش گوئی ہے۔ المعتصم کا سب سے قریبی پرتو ایک نہایت مسرور اور بااخلاق ایرانی کتب فروش ہے، جس کا جد ایک ولی تھا۔۔۔

برسوں کی مسافت کے بعد طالب علم ایک ڈیوڑھی پر پہنچتا ہے، جس کے پچھواڑے ایک دروازہ ہے، جس پر بھری ہوئی بُنت والی ایک سستی سی چق پڑی ہوئی ہے، اور اس کے پیچھے سے ایک نور پھوٹ رہا ہے۔ طالب علم تالی بجاتا ہے، ایک بار، پھر دوسری بار، اور المعتصم کو پوچھتا ہے۔ ایک شخص کی آواز -- المعتصم کی ناقابلِ یقین آواز -- اسے اندر آنے کو کہتی ہے۔ طالب علم چق اٹھاتا ہے اور قدم آگے بڑھاتا ہے۔ یہ ناول کا اختتام ہے۔

اگر میں دھوکے میں نہیں ہوں تو اس قسم کے خیال کی کامیاب پیش کش لکھنے والے پر دو ذمےداریاں عائد کرتی ہے، ایک تو پیغمبرانہ اوصاف کی متنوّع اختراع، اور دوسرے یہ احتیاط کہ کہانی کا ہیرو، جسے ان اوصاف سے متّصف کیا گیا ہے، کوئی روایت یا خالی پیکر نہ بنا رہ جائے۔ پہلی ذمےداری بہادر علی نے نبھائی ہے، میں نہیں جانتا کہ دوسری ذمےداری کو اس نے کہاں تک پورا کیا ہے، یعنی وہ کس حد تک غیرمعمولی اور غیرمرئی المعتصم کو، پھیکے بلند بانگ اوصاف کے انبار کے بجائے، ایک حقیقی کردار بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ ۱۹۳۲ والے ورژن میں ماورائے فطرت اشارات خال خال ہیں۔ "المعتصم نامی شخص" ایک حد تک علامت ضرور ہے، لیکن وہ مخصوص شخصی خدوخال گم نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے یہ عمدہ ادبی رویہ زیادہ عرصے برقرار نہ رہا۔ ۱۹۳۳ والے ایڈیشن میں، جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے، ناول ایک تمثیل میں

غرق ہو جاتا ہے، المعتصم اب خدا کا استعارہ ہے، اور ہیرو کی حقیقی خانہ بدوشی ایک طرح سے صوفیانہ ارتفاع میں روح کی درجہ بدرجہ ترقی کا روپ دھار لیتی ہے۔ فاش تفصیلات کی بھرمار ہو جاتی ہے، کوچیں کا ایک سیاہ فام یہودی المعتصم کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی جلد کی رنگت سیاہ ہے، ایک عیسائی کے کہنے کے مطابق وہ ایک بلند مینار پر اپنے بازو پھیلائے کھڑا ہے، ایک سرخ جلد والے لاما کو یاد پڑتا ہے کہ "میں نے اسے یاک کی چربی سے بنے اس مجسمے کی طرح بیٹھے دیکھا، جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا، اور جس کی میں تاشیل ہمپو کی خانقاہ میں عبادت کیا کرتا تھا"۔ ان سارے اعلانات کا مقصد ایک خدائے واحد کا تصور قائم کرنا ہے جو انسانی تنوّع کے لحاظ سے خود کو تبدیل کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ خیال اتنا متاثرکن نہیں۔ یہ بات میں اس کے متبادل خیال کے بارے میں نہیں کہہ سکتا جس کی رُو سے خدا کو بھی کسی اور ہستی کی جستجو ہے، اور کسی اور ہستی کو بھی اپنے سے بالاتر (یا کم از کم اپنے مساوی) ایک اور ناگزیر ہستی کی، اور اس طرح یہ جستجو انتہا تک -- یا بہتر ہو گا کہ لاانتہا تک -- اور کسی مدوّر صورت میں ہمیشہ ہمیشہ جاری ہے۔ لغوی اعتبار سے المعتصم پناہ ڈھونڈنے والے کے معنی رکھتا ہے۔ (یہ نام آٹھویں عباسی خلیفہ کا بھی ہے، جو آٹھ جنگوں کا فاتح تھا، اور جس کی اولاد میں آٹھ لڑکے تھے اور آٹھ لڑکیاں، اور جس نے اپنے پیچھے آٹھ ہزار غلام چھوڑے اور آٹھ سال، آٹھ ماہ اور آٹھ دن حکومت کی۔) ۱۹۳۲ والے ورژن میں اس تک رسائی کی دشواری کا جواز یہ خیال ہو سکتا تھا کہ مسافرت کا حاصل محض ایک مسافر ہے۔ ۱۹۳۳ والے روپ میں اس دشواری سے اس متجاوز مذہبی نظریے کی بنیاد فراہم ہوتی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میر بہادر علی، جیسا کہ ہم نے دیکھا، فی کی سب سے عامیانہ ترغیب سے کنارہ کش ہونے میں ناکام رہا، ایک جینیئس بننے کی ترغیب۔

اپنی اس تحریر پر نظرِ ثانی سے مجھے احساس ہوا کہ شاید میں نے کتاب کی خوبیوں کا مناسب طور پر بیان نہیں کیا۔ اس میں بعض بڑے تہذیب یافتہ اظہار موجود ہیں۔ مثال کے طور پر انیسویں باب میں پڑھنے والے کو ایک کردار میں المعتصم کے دوست کے وجود کا ادراک ہوتا ہے جب وہ اپنے مخالف کے مغالطے کی محض اس وجہ سے تردید نہیں کرتا کہ راستی کے غرور میں مبتلا نہ ہو جائے۔

یہ بڑی معزز بات سمجھی جاتی ہے کہ آج کی لکھی ہوئی کوئی کتاب کسی قدیم کتاب سے مشتق ہو، خصوصاً جبکہ کوئی شخص (بقول جانسن) اپنے عم عصروں کا احساں مند ہونا نہیں چاہتا۔ جوئس کی "یولیسس" کی، ہومر کی "اوڈیسی" سے متعدّد، لیکی غیراہم، مماثلتوں کو ، میں نہیں سمجھتا کہ کیوں، اب تک نقادوں کی بےمغز تحسین حاصل ہے۔ بہادر علی کے ناول کی فریدالدّین عطار کی محترم کتاب "منطق الطّیر" سے مشابہت کو بھی لندن، اور حتیٰ کہ الہ آباد اور کلکتے کی یہ عجیب و غریب توصیف عطا ہوئی۔ اس کے علاوہ بہادر علی کے ناول کی دوسری مشابہتیں بھی نظرانداز نہیں کی گئیں۔ ایک متجسّس نے ناول کے پہلے منظر اور کپلنگ کی کہانی "شہر کی دیوار پر" کے بعض عناصر کی مطابقت کا سراغ لگایا ہے۔ بہادر علی اس

Scanned with CamScanner

مطابقت کا اعتراف کرتا ہے، لیکن اس دلیل کے ساتھ کہ یہ انتہائی غیرفطری بات ہو گی کہ محرّم کی دسویں رات پر بنائی گئی دو تصویروں میں کچھ نہ کچھ مطابقت نہ ہو۔

اس سے بھی بڑے مصنف ایلیٹ کو نامکمّل تمثیل "دی فیری کوئین" کے ستّر کینٹوز یاد آتے ہیں، جن میں ہیروئن گلوریانا ایک بار بھی نمودار نہیں ہوتی، جیسا کہ رچرڈ ولیم چرچ کے ناقدانہ مضمون (اسپنر ۱۸۷۹) میں نشان دہی کی جا چکی ہے۔ نہایت انکسار کے ساتھ میں ایک بہت دور دراز کے ممکنہ پیش رو کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں: یروشلم کا داستان گو آئزک لیوریا جس نے سولھویں صدی میں دعوا کیا تھا کہ کسی جد یا آقا کی روح کسی بدنصیب کو تسکین یا ہدایت دینے کے لیے اس کی روح میں داخل ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے تناسخ کو "ابّر" کہا جاتا ہے۔ (۱۹۳۵)

اس نوٹ کے سلسلے میں میں نے ایرانی صوفی فریدالدّین ابوطالب محمد بن ابراہیم عطار کی "منطق الطّیر" سے رجوع کیا، جو نیشا پور کی فتح کے وقت چنگیز خاں کے تولوئی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس طویل نظم کا خلاصہ بیان کرنا غالباً بےجا نہ ہو گا۔ پرندوں کا دور افتادہ بادشاہ سیمرغ چین کے وسطی علاقے میں اپنا ایک پَر گرا دیتا ہے۔ قدیم بَراج سے اُکتائے ہوئے پرندے اسے تلاش کرنے کا تہیّہ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بادشاہ کے نام کا مطلب ہے تیس پرندے، اور یہ کہ اس کا شاہی محل کوہ قاف پر ہے، یعنی پہاڑوں کے اس مدوّر سلسلے پر جو زمین کی فصیل ہے۔ وہ ایک ختم نہ ہونے والی مہم کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ وہ سات وادیوں سات سمندروں کو پار کرتے ہیں جن میں سے آخری دو کے نام دوراں سر اور فنا ہیں۔ بہت سے پرندے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، باقی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے صرف تیس پرندے، جو صعوبتوں کے ہاتھوں بالکل پاک ہو چکے ہیں، سیمرغ کے پہاڑ پر قدم رکھتے ہیں۔ انجام کار غور کرنے پر وہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ وہی سیمرغ ہیں، اور سیمرغ وہ سب اور اُن میں سے ہر ایک ہے۔ (فلاطینوس کے Enneads میں بھی وحدت کے اصول کی آسمانی پھیلاؤ کا بیان موجود ہے: "بہشت کے قابلِ فہم تصوّر میں ہر شے ہر جگہ موجود ہے، ہر جزو کل ہے، سورج کا مطلب ہے ہر ستارہ، اور ہر ستارے سے مراد ہے تمام ستارے اور سورج"۔ "منطق الطّیر" کا فرانسیسی میں ترجمہ گارساں دتاسی نے کیا ہے اور انگریزی میں ایڈورڈ فٹزجیرالڈ نے۔ اس نوٹ کے لیے مَیں نے برٹن کی "الف لیلہ و لیلہ" اور مارگریٹ اسمتھ کے مضمون "فارس کے صوفی: عطّار" سے مدد لی ہے۔

اس نظم اور بہادر علی کے ناول میں مشابہت کے نکات بہت زیادہ نہیں ہیں۔ بیسویں باب میں کچھ الفاظ جو ایرانی کتب فروش نے المعتصم سے منسوب کیے ہیں، غالباً کچھ اور الفاظ کا مبالغہ ہیں جو ہیرو نے اصل میں کہے ہوں گے۔ یہ، اور چند دوسری مشابہتیں، صرف جستجو کرنے والے کی جستجو کے مقصد سے اکائی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جستجو کا مقصد جستجو کرنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک اور باب میں گمان ہوتا ہے کہ المعتصم وہ ہندو ہے جو طالبِ علم کے خیال میں اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔

(خ۔ ل۔ ب۔)

ooooo

پیراڈائزو

دیودورس سیکولس ایک ٹوٹے اور بکھرے ہوئے خدا کی کہانی بیان کرتا ہے۔ ہم میں سے کس نے جُھٹ پُٹے میں چلتے ہوئے، یا ماضی کی کوئی تاریخ ڈالتے ہوئے، کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ کوئی بےنہایت شے گم ہو گئی ہے؟

انسانوں سے ایک چہرہ گم ہو گیا ہے، دوبارہ نہ مل سکنے والا ایک چہرہ۔ اور تمام لوگ وہ یاتری ہونے کی آرزو کرتے ہیں جو روم میں ویرونیکا کو دیکھتا ہے اور وفاداری سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے: "میرے خداوند! یسوع مسیح! اے سچّے خدا! کیا تیری شباہت کی وضع یہی تھی؟"

ایک سڑک کے کنارے پتھر کا بنا ہوا ایک چہرہ ہے، جس پر کھدا ہوا ہے: "زائنس کے خداوند کے مقدس چہرے کی سچی شبیہ"۔ اگر ہم واقعی یہ جان سکیں کہ وہ کیسا تھا، تو تمام حکایات کی کنجی ہماری ہو گی، اور ہم یہ جان جائیں گے کہ آیا بڑھئی کا بیٹا واقعی خدا کا فرزند تھا۔

پال نے اسے ایک روشنی کی صورت میں دیکھا، جس سے وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ جان کو وہ پوری شدّت سے جلتے ہوئے سورج کی طرح نظر آیا۔ لیاؤں کی تیریزا نے اسے کئی مرتبہ دیکھا، ایک ساکت نور میں تربترا اور وہ کبھی اس کے آنکھوں کے رنگ کا اندازہ نہ کر سکی۔

ہم نے یہ خدوخال کھو دیے ہیں، جس طرح کوئی رسمی ہندسوں سے بنا ہوا ایک طلسمی عدد کھو بیٹھے، یا جیسے کوئی بدلتی ہوئی شبیہوں کے آئینے میں کسی شبیہ کو ہمیشہ کے لیے گم کر دے۔ ہم، ہو سکتا ہے، ان نقوش کو دیکھتے ہوں، اور ان سے بےخبر رہتے ہوں۔ گلی سے گذرتے ہوئے کسی یہودی کا رخ شاید مسیح کا رخ ہے؛ ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے ہمیں ریزگاری لوٹانے والے ہاتھ شاید اُن ہاتھوں کی تکرار ہیں جنھیں ایک روز سپاہیوں نے صلیب پر کیلوں سے جڑ دیا تھا۔

شاید اس مصلوب صورت کے کچھ نقوش ہر آئینے میں جھلکتے ہیں۔ شاید وہ چہرہ اس لیے مٹ گیا، منسوخ ہو گیا تاکہ خدا، ہم سب ہو سکے۔

کون جانتا ہے کہ آج رات ہم اپنے خوابوں کی بھول بھلیّوں میں اسے نہیں دیکھیں گے، اور کل اسے جانتے تک نہ ہوں گے۔

گواہ

پتھر کے بنے ہوئے نئے گرجا کے تقریباً سائے میں واقع ایک اصطبل میں بھوری آنکھوں اور بھوری داڑھی والا ایک شخص حیوانوں کی باس کے درمیان لیٹا عاجزی سے موت کا یوں منتظر

Scanned with CamScanner

ہے جیسے کوئی نیند کا انتظار کرتا ہو۔ دن، ہمہ گیر پوشیدہ قوانین کی تعمیل میں، رفتہ رفتہ ڈھلتا ہے اور اس حقیر کونے میں سائے گھولتا جاتا ہے۔ باہر ہل چلائے ہوئے کھیت ہیں، مردہ پتّوں سے اٹی ہوئی ایک کھائی ہے، اور جنگل کے سرے پر بھیڑیوں کے قدموں کے مٹ جانے والے نشان ہیں۔ یہ شخص، جس کے وجود سے کوئی باخبر نہیں، سوتا اور خواب دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھ فرشتے کی آمد سے کھلتی ہے۔

اب تک گھنٹیوں کی آوازیں انگلستان کی سلطنت میں شام کا معمول بن چکی ہیں۔ لیکن یہ شخص، اپنے بچپن میں، ووڈن کے چہرے، مقدس ہیبت اور سرخوشی، رومی سکّوں اور بھاری پوشاکوں سے لدے لکڑی کے بھدّے بُت، اور گھوڑوں، کتّوں اور قیدیوں کی قربانی کا نظارہ کر چکا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے وہ مر چکا ہو گا، اور اس میں ان بُت پرستوں کی رسوم کا آخری عینی شاہد کبھی نہ لوٹنے کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اس سیکسن کے مرنے سے دنیا کچھ اور مفلس ہو جائے گی۔

زماں و مکاں کی وسعتوں میں پھیلے لوگوں پر اثرانداز ہونے والے واقعات، اپنی ہمہ گیری کے باوجود صرف ایک شخص کے مر جانے کے ساتھ مٹ جاتے ہیں۔ لیکن ہر موت میں کوئی چیز، یا بےشمار چیزیں، ختم ہو جاتی ہیں، سوائے اس کے کہ کائنات کسی برتر یادداشت کا حصّہ ہو، جیسا کہ تھیوسوفسٹ خیال کرتے تھے۔

وقت کے بہاؤ میں کہیں ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب یسوع کو دیکھنے والی آخری آنکھیں بند ہو گئیں۔ جونین کی جنگ اور ہیلن کا عشق، کسی ایک شخص کے مر جانے پر موت تک پہنچے۔ جب مَیں مروں گا تو کیا کچھ میرے ساتھ ختم ہو جائے گا؟ کون سی حقیر یا ناپائیدار شے دنیا سے کم ہو جائے گی؟ میکیڈونیو فرنانڈیز کی آواز؟ سیرانو یا چارکاس کی ویران وسعتوں میں ایک چتکبرے گھوڑے کی شبیہ؟ مہاگنی کی میز کی دراز میں رکھی گندھک کی ایک سلاخ؟

تغیّرات

میں نے ایک ہال میں راستا بتانے والا تیر کا ایک نشان دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ بےضرر سی علامت کبھی لوہے کی ایک شے رہ چکی ہے، ایک بےخطا مہلک قوس جو انسانوں اور شیروں کے گوشت میں اتر جاتی تھی، اور جس نے تھرموپائیلے میں سورج کی کرنوں کا راستا روک دیا تھا، اور ہیرالڈ سیگرڈسن کو انگلستان کی چھ فیٹ زمین ہمیشہ کے لیے بخش دی تھی۔

چند روز بعد کسی نے مجھے ایک مَگیار شہسوار کی تصویر دکھائی۔ ایک تازیانہ لہرا کر اس کے راہوار کے سینے پر لپٹ گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ تازیانہ، جو کبھی ہوا میں سنسناتا

تھا اور سرکش پہاڑی بیلوں کو ہموار کر لیتا تھا، اب اتوار کی رسمی شہسواری کے نمائشی ساز کے ایک حصے سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا۔

مغربی قبرستان میں میں نے گوتھک طرز کی ایک صلیب دیکھی، جو سنگِ سرخ میں تراشی گئی تھی؛ بازو باہر کو پھیل کر خم کھا گئے تھے اور ایک دائرے نے انھیں جکڑ رکھا تھا۔ وہ کوتاہ اور محدود صلیب، کھلے بازوؤں والی ایک اور صلیب کی نمائندہ تھی، جو خود اس سولی کی طرف اشارہ کرتی تھی جس پر ایک خدا کو ایذا پہنچائی گئی تھی؛ ایک نامبارک کل جس کا سموستا کے لوشین نے مضحک اڑایا تھا۔

صلیب، تازیانہ اور تیر، انسان کے متروک اوزار، جنھیں حقیر یا سرفراز کر کے اب محض علامات کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ میں ان پر حیرت کیوں کروں؟ جب کہ روئے زمین پر کوئی شے ایسی نہیں جو فراموشی کے ہاتھوں مٹ نہ چکی ہو یا یادداشت کے ہاتھوں متغیّر نہ ہو گئی ہو، اور جب کہ کوئی نہیں جانتا کہ وقت خود اسے کس علامت کی شکل دے دے گا۔

خنجر

ایک خنجر دراز میں رکھا ہے۔

اسے پچھلی صدی کے آخر میں تولیدو میں ڈھالا گیا تھا۔ لوئس میلیان لافینر نے اسے میرے باپ کو دیا تھا جو اسے یوروگوے سے لے آیا۔ ایوریستو کیریگو نے ایک مرتبہ اسے اپنے ہاتھ میں تھاما تھا۔

جس کسی کی نگاہ اس پر پڑتی ہے، وہ اسے اٹھانے اور الٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جیسے وہ ہمیشہ سے اس کی تلاش میں رہا ہو۔ ہاتھ تیزی سے منتظر دستے کو گرفت کر لیتا ہے، اور طاقتور فرمانبردار پھل کلِک کی آواز سے کھلنے بند ہونے لگتا ہے۔

یہ وہ نہیں جو خنجر چاہتا ہے۔

یہ دھات کے ایک ڈھالے ہوئے خوبصورت ٹکڑے سے کچھ زیادہ ہے۔ انسانوں نے جب اس کا تصوّر کیا اور اسے شکل دی، تو ان کے ذہن میں ایک ہی مقصد تھا۔ کسی اُلوہی انداز میں یہ وہی خنجر ہے جو کل رات تاکوارامبو میں ایک شخص کے جسم میں گھونپا گیا، اور وہ خنجر بھی جو سیزر کے جسم میں پیوست ہوا۔ یہ قتل کرنا چاہتا ہے، خون کے اُبلتے ہوئے فوّارے چاہتا ہے۔ میری لکھنے کی میز کی دراز میں، مسوّدوں اور پرانے خطوں کے درمیان، خنجر اپنا چیتے کا سا سادہ خواب بار بار دیکھتا ہے۔ اسے تھامنے پر ہاتھ جی اٹھتا ہے، کیوں کہ دھات جی اٹھتی ہے، ہر بار اس قاتل کا لمس محسوس کر کے جس کے لیے اسے ڈھالا گیا تھا۔

کبھی کبھی مجھے اس پر افسوس ہوتا ہے۔ ایسی قوّت اور یکسوئی، ایسا سنگدل یا معصوم غرور، اور سال ہیں کہ بےنیازی سے گذرتے چلے جا رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

الوداع

ہم نے گیارھویں شاہراہ کے کونے پر ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ سڑک کے اس پار پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تم بھی مڑیں اور ہاتھ ہلا کر مجھے الوادع کا اشارہ کیا۔

لوگوں اور گاڑیوں کا ایک دریا ہمارے درمیاں بہنے لگا۔ یہ ایک عام سی — پھر میں پانچ بجے کا وقت تھا۔ میں کیسے جان سکتا تھا کہ یہ غمناک اور اَجیت دریائے ایکروی ہے۔

اور اب میں اس یاد کو ڈھونڈ نکالتا ہوں اور اس پر نظر کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ جھوٹ تھا، اور شاید اس الوداع کے پیچھے ایک دائمی جدائی تھی۔

کل رات کے کھانے کے بعد میں اندر ہی ٹھہرا رہا اور ان چیزوں کو سمجھنے کی خاطر وہ آخری تعلیمات پھر سے پڑھتا رہا جو افلاطون نے اپنے استاد سے منسوب کی ہیں۔ میں نے پڑھا کہ جب جسم کا خاتمہ ہو جائے تو روح نکل کر جا سکتی ہے۔

اور اب میں نہیں جانتا کہ حقیقت اس یقینی الوداع میں ہے یا اس کی نامبارک تاویلات میں۔

کیونکہ اگر روح کو موت نہیں تو ہمیں الوداع کہنے کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

ایک دوسرے کو الوداع کہنا جدائی کا انکار کرنا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ "آج ہم جدا ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں، لیکن کل پھر ملیں گے"۔ انساں نے الوداع کی رسم اس لیے ایجاد کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ جانتا ہے کہ وہ لافانی ہے، چاہے بظاہر وہ بےدلیل اور لمحاتی ہی معلوم ہوتا ہو۔

کبھی نہ کبھی، ڈیلیا (کس دریا کے کنارے؟) ہم اپنا یہ غیریقینی مکالمہ ایک بار پھر جوڑ لیں گے، اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ کیا کسی میدانی علاقے میں گم شدہ ایک شہر میں ہم بورخیس اور ڈیلیا رہ چکے ہیں۔

یونانی انتھولوجی کے ایک چھوٹے شاعر سے

کہاں ہے اب یاد
ان دنوں کی جو اس زمیں پر تمھارے تھے
جو مسرّتوں کو غموں کے ساتھ بُنتے تھے
اور ایک ایسی کائنات بناتے تھے جو تمھاری اپنی تھی

برسوں کے دریا نے
انھیں اپنے بہاؤ کے شمار سے نکال دیا
اور اب تم ایک فہرست میں محض ایک لفظ ہو

دیوتاؤں نے دوسروں کو شان و شوکت بخشی جس کا کبھی خاتمہ نہیں؛
دستاویزات، سکّوں پر کھدے نام، یادگاریں، ایماندار مورخ؛
اور تمھارے بارے میں، اے گنوائے ہوئے دوست،
ہم صرف اتنا جانتے ہیں
کہ ایک شام تم بلبل کی آواز سنتے تھے

سایوں کے درخت میں
تمھارا پُرغرور سایہ
دیوتاؤں کو نامہربان گردانتا ہو گا

لیکن دی چھوٹے چھوٹے دکھوں کے تانےبانے ہیں
اور وہ راکھ بن جانے سے بڑھ کر کیا سعادت ہو گی
جس سے فراموشی بنی ہے

دوسروں کے سروں پر دیوتاؤں نے عظمت کی ایسی روشنی نصب کر دی
جو چھپے گوشوں کو بےنقاب کرتی ہے
اور ہر خطا کو دریافت کر لیتی ہے
عظمت، جو جس گلاب پر نگاہ کرتی ہے بالآخر اسے مسل ڈالتی ہے
دیوتا تم پر زیادہ مہرباں تھے، میرے بھائی

اس بےانت شام میں جو کبھی رات نہ ہو گی
تم تھیوکریٹس کی اس بلبل کی آواز سدا سنتے رہو گے

شطرنج

ایک گھمبیر کونے میں بیٹھے کھلاڑی سُست رَو مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں

Scanned with CamScanner

شطرنج کی بساط سورج نکلنے تک انھیں اپنی قید میں رکھتی ہے
اس بساط پر دو رنگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں

مہروں کی مختلف شکلوں میں کھیل کے طلسمی قوانین پوشیدہ ہیں؛
ہومر کے یونانی قلعے، سبک رفتار گھوڑے،
جنگجو ملکہ، پیچھے رہ کر فیصلے کرنے والا بادشاہ
غیرمنصف پیشوا اور حملہ آور پیادے

کھلاڑیوں کے اٹھ جانے کے بعد،
اور موت کے گھاٹ اتر جانے کے بعد بھی،
یہ رسم جاری رہتی ہے
اس جنگ کی آگ پہلے پہل مشرق میں بھڑکی تھی

اور اب ساری دنیا اس کی تماشاگاہ ہے
محبت کی طرح یہ کھیل بھی دائمی ہے

بزدل بادشاہ، عیار پیشوا، بےرحم ملکہ
مضبوط قلعہ، حیلہ ساز پیادے
اپنے سیاہ اور سفید راستوں پر چڑھائی کرتے
اور جنگ کا آغاز کرتے ہیں

وہ نہیں جانتے کہ ان کی تقدیر کے پیچھے
شطرنج کے کھلاڑی کا مشاق ہاتھ ہے
وہ نہیں جانتے کہ ان کی خواہش سے بےنیاز، ایک سفاک تقدیر
جنگ کی یہ بساط بچھاتی ہے
لیکن کھلاڑی خود بھی کسی اور بساط پر تقدیر کا زندانی ہے
(یہ قول عمر خیام کا ہے)
جو اندھیری راتوں اور روشن دنوں سے مل کر بنی ہے
خدا اسے حرکت دیتا ہے اور وہ مہروں کو

لیکن خدا کی پشت پر کون ہے جس نے
خاک اور وقت اور خواب اور کرب کے
اس کھیل کا آغاز کیا ہے؟

متّی : XXV، ۳۰

کانسٹی ٹیوشن کے ریلوے اسٹیشن کا پل، میرے قدموں تلے
آتی جاتی گاڑیاں اپنی بھول بھلیّوں کے راستے ناپتی ہیں
بھاپ پُرشور سسکاری کے ساتھ رات میں اوپر چڑھتی ہے
جو ایک ہی لمحے میں یوم حساب کی رات ہے
نظروں سے اوجھل افق سے
-- میری ہستی کے مرکز سے --
ایک لامحدود آواز یہ چیزیں ادا کرتی ہے -- چیزیں، الفاظ نہیں --
وقت میں قید یہ میرا ناقص ترجمہ ہے
اس شے کا، جو ایک طویل لامتناہی لفظ تھا؛

ستارے، روٹی، مشرق و مغرب کے کتب خانے
تاش کے پتّے، شطرنج کی بساطیں، گیلریاں، آسمانی روشنیاں، تہ خانے
زمیں پر چلنے پھرنے کے لیے ایک انسانی جسم
خواب اور موت میں بڑھتے ہوے ناخن
فراموشی کے لیے سائے، ضرب دینے میں مشغول آئینے
موسیقی کی آبشاریں، وقت کی شکلوں میں سب سے زیادہ نازک
برازیل اور یوروگوے کی سرحدیں، گھوڑے اور صبحیں
کانسی کا باٹ، گریٹر ساگا کی ایک جلد
الجبرا اور آگ، جونین میں تمھارے لہو کی دھمک
بالزاک سے زیادہ پُرہجوم دن، عشق پیچاں کی خوشبو
محبت، اس کی ناگزیریت اور ناقابلِ برداشت یادیں
مدفون خزانوں جیسے خواب، مہرباں تقدیر
اور خود یادداشت، جس پر ایک نظر آدمی کو دورانِ سر میں مبتلا کر دیتی ہے
یہ سب کچھ تمھیں دیا گیا اور اس کے ساتھ وہ
جو سورماؤں کی قدیم غذا ہے ،
غداری، شکست اور توہین
سمندروں کا پھیلاؤ تم پر ضائع ہو گیا
اور دشمن کی آنکھ سے دیکھا جانے والا شاندار سورج
اور تمام برس جن کو تم نے (اور جنھوں نے تمھیں) صرف کیا،
اور پھر بھی، پھر بھی تم نے نظم نہیں لکھی

دو مابعدالطبیعیاتی پیکر

انسانی شعور کی اصل کے اسرار کی تحقیق سے تصوّراتی حیوانیات کو دو عجیب مخلوقات ملی ہیں۔ ان میں سے ایک کا ظہور اٹھارویں صدی کے تقریباً وسط میں ہوا اور دوسری کا سو برس بعد۔

پہلی مخلوق اتین ابی بونو ٔدکوں‌دیاک (Etiene Bonnot de Condillac) کا حساس مجسمہ ہے۔ دیکارت (Descartes) جبلّی خیالات کے افلاطونی نظریے کا موئید تھا۔ کوں‌دیاک نے اس کا رد کرنے کی غرض سے ایک سنگی مجسمے کا تصور کیا جو انسانی جسم کی مشابہت میں تھا، اور ایک ایسی روح کا مسکن تھا جو خیال یا ادراک سے کبھی آشنا نہیں ہوئی تھی۔ کوں‌دیاک اپنے مجسمے کو سب سے پہلے صرف ایک حس سے متّصف کرتا ہے؛ سونگھنے کی حس، جو تمام حسّیات میں شاید سب سے کم پیچیدہ ہے۔ یاسمین کی مہک کا ایک جھونکا مجسمے کے سوانح کی ابتدا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس پوری کائنات میں اس مہک کے سوا کچھ نہیں؛ یا زیادہ درست یہ ہو گا کہ کائنات یہی مہک ہے، جو اگلے لمحے گلاب کی خوشبو ہو گی، پھر گلنار کی۔ جب مجسمے کا شعور کسی ایک مہک کا مسکن ہوتا ہے تو توجہ جنم لیتی ہے۔ جب کوئی خوشبو اپنے محرّک کے ختم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے تو یادداشت ملتی ہے۔ جب ایک موجود اور ایک گزشتہ تاثر بیک وقت مجسمے کی توجہ کو مسکن کرتے ہیں تو تقابل کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ جب مجسمہ پسند اور ناپسند کا ادراک کرتا ہے تو قوتِ فیصلہ نظر آتی ہے۔ تقابل اور فیصلے کی صلاحیت کے دوبارہ ظاہر ہونے سے سوچ بچار کا جنم ہوتا ہے۔ جب ایک خوش کن مہک ایک ناگوار تاثر سے زیادہ واضح ہو تو تخیّل ملتا ہے۔ سمجھنے کی صلاحیت سے خواہش پیدا ہوتی ہے؛ کشش اور تنفّر، امید اور خوف۔ بہت سی ذہنی کیفیات سے گزر چکے ہونے کا شعور مجسمے کو اعداد کا مجرّد تصور عطا کرتا ہے؛ اور گلنار کی خوشبو ہونے، اور یاسمین کی مہک رہ چکے ہونے کے اِدراک سے انا کا تصور جنم لیتا ہے۔

اس کے بعد مصنف اپنے مفروضہ آدمی کو سننے کی حِس عطا کرتا ہے، پھر چکھنے کی، پھر دیکھنے کی، اور سب سے آخر میں چھونے کی حِس بخشتا ہے۔ یہ آخری حس اس پر منکشف کر دے گی کہ مکاں موجود ہے، اور یہ کہ مکاں کے سیاق و سباق میں وہ خود ایک جسم میں موجود ہے۔ اس مقام سے پہلے آوازیں، خوشبوئیں اور رنگ اس کے لیے محض اس کے شعور کی تغیّرات تھیں۔

یہ تمثیل جو ابھی بیان کی گئی Traité des sensations سے موسوم ہے اور ۱۸۵۴ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس خلاصے کے لیے ہم نے برے اَئیر (Bréhier) کی تاریخ فلسفہ (Histoire de la philosophie) کی دوسری جلد سے استفادہ کیا ہے۔

دوسری مخلوق جس کا ظہور انسانی شعور کے قضیے سے ہوا، رڈولف ہرمن لوتسے

(Rudolph Hermann Lotze) کا "مفروضاتی حیوان" (hypothetical animal) ہے۔ گلاب سونگھنے اور بالآخر ایک انساں بن جانے والے مجسمے سے زیادہ تنہا یہ وجود اپنی کھال میں صرف ایک متحرّک حساس نقطہ رکھتا ہے، جس کی شدت اینٹینا کی طرح ہے۔ اس کی ساخت، جیسا کہ ظاہر ہے، ایک وقت میں ایک سے زیادہ ادراکات کے قابل نہیں۔ لوتسے کا اصرار ہے کہ اپنے حساس نقطے کو پھیلانے اور سکیڑنے کی صلاحیت اس محرومِ محض حیوان کو (کانٹ کے بیاں کردہ درجاتِ زماں و مکاں کے بغیر) اس قابل کر دے گی کہ وہ اپنے بیروں کی دنیا کو دریافت کر سکے۔ یہ قصہ Medizinische Psychologie (۱۸۵۲) میں ملتا ہے۔ ہانس ویہنگر (Hans Vaihinger) اس کی مدح کر چکے ہیں۔

(The Book of Imaginary Beings سے)

(ہسپانوی)
انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

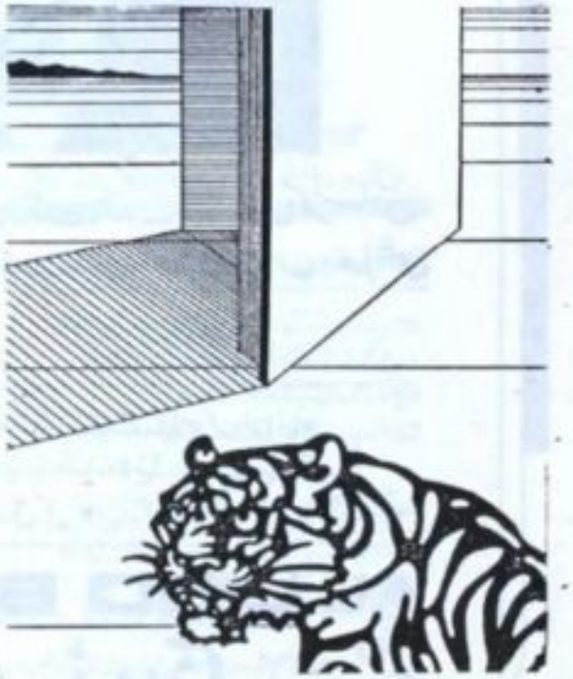

Scanned with CamScanner

نیوپولیس اسٹیشن اور رنگی ٹاؤن سیکٹر ۱۵ سے قریب، کے ڈی اے سے
منظور شدہ پہلا کم قیمت رہائشی و کمرشل پروجیکٹ
سونے جیسی زمین۔ مفت کے دام
گلشنِ توحید
گلشنِ بہار سے نزدیک
تمام شہری سہولیات
بشمول
پانی، بجلی اور گیس
بکنگ صرف
2500 روپے
ماہانہ قسط 300 روپے
گلشنِ توحید، ٹاؤن پلانرز کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے، پُرسکون اور پُرفضا مقام پر
واقع یہ رہائشی و کمرشل پروجیکٹ بہتر طرزِ رہائش اختیار کرنے کے خواہشمند افراد کیلئے مثالی انتخاب ہوگا۔
مستقبل کی محفوظ سرمایہ کاری
وقتِ مقررہ پر پلاٹ کا قبضہ
گلشنِ توحید میں فراہم کردہ سہولیات
• ہسپتال • کمیونٹی سینٹر • اسکولز • شاپنگ سینٹر
• پلے گراؤنڈ • شادی ہال • فوارے • مسجد
• بچوں کے لئے پارک • آبشاریں۔
ٹرانسپورٹ ہر وقت دستیاب ہے
U-9 1-H 4-Z 13-Z 1-D
N.O.C. NO.MP/DCE(D) 1360/ADV/1084/89
دفتر جمعہ اور دیگر تعطیلات میں بھی کھلا رہے گا
رجوع کریں:-
ندیم ہاؤسنگ انٹرپرائز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
605 چھٹی منزل کاشف سینٹر نزد ہوٹل مہران، شاہراہ فیصل کراچی۔ فون 522079 522237
Maxim

۱۴ اگست
ان سنہرے الفاظ کی چمک دمک
آج بھی برقرار ہے
"کوئی ملک یا کوئی قوم اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتی
جب تک کہ وہ زراعت، تجارت اور صنعت میں معاشی
استحکام نہ حاصل کر لے"
— قائداعظم
الائیڈ بینک نجی شعبے کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جو کردار انجام
دے رہا ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ الائیڈ بینک اپنی روشن
خدمات اور بے مثل حسنِ اخلاق کی بناء پر آپ کی اولین ترجیح ہے۔
ALLIED BANK
الائیڈ بینک
PARAGON

Scanned with CamScanner